تعلیم و تربیت
سالنامہ
جون 2005
سلام اُن پر خدا کے بعد جو یکتا ہیں' الٰہی ہیں
(صفحہ 6)
چچا حیرت بنے حکیم
(صفحہ 21 پر)
ٹھوکر
(صفحہ 64 پر)
ایک ایسی کہانی جو آپ کو سوچنے پر مجبور کردے گی
اندھا دھند
(صفحہ 84 پر)
(صفحہ 56 پر)
ماں
(صفحہ 21)

65واں سال تیسرا شمارہ

تعلیم و تربیت

پاکستان میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا

بچوں کا محبوب رسالہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

السلام علیکم و رحمۃ اللہ!

اُمید ہے آپ ہنسی خوشی ہوں گے۔

لیجیے 'سالنامہ "تعلیم و تربیت" حاضر ہے۔ ہم نے حسبِ وعدہ اس میں آپ سب کی تمام دلچسپیوں کا سامان پورے بارہ مسالوں کے ساتھ شامل کرنے کی کوشش کی ہے' اس میں آپ کو ہنستی مسکراتی تحریریں بھی ملیں گی اور خوفناک مہماتی کہانیاں بھی۔ مزے مزے کی نظمیں' حیران کن معلومات' سبق آموز تاریخی قصے اور مختصر تعارف کے ساتھ "تعلیم و تربیت" میں لکھنے والے محترم ادیبوں اور شاعروں کی تصاویر' آٹوگراف' خصوصی پیغامات' زندگی کو کامیاب بنانے والے رہنما اصول اور اقوالِ زریں بھی آویزاں نظر آئیں گے اور .... قوسِ قزح کے یہ سارے رنگ پیارے بچو' آپ ہی کے لیے ہیں!

الحمدللہ! سالنامے کی تیاری میں جہاں ملک کے تمام نامور لکھنے والوں کا قلمی تعاون حاصل رہا وہاں ہماری پوری ٹیم لگن' کوشش اور دن رات کی محنت کے ساتھ ہمہ دم مصروفِ کار رہی ہے اور یہ سب کچھ آپ' ننھے منوں کی پُرخلوص دعاؤں اور اللہ رب العزت کے فضل و کرم کا نتیجہ ہے۔ ساتھیو! "سالگرہ نمبر" آپ کو کیسا لگا' ہمیں بتایئے گا ضرور! ہمیں آپ کی رائے کا انتظار رہے گا۔

"دیکھیے' ہمیں آپ کا کتنا خیال ہے! اِدھر گرمی کی چھٹیاں شروع اور اُدھر "تعلیم و تربیت" کا رنگارنگ سالگرہ نمبر آپ کے ہاتھوں میں' ہے نا خوشی کی بات! ...... تو پھر ہماری یہ بات بھی غور سے سن لیجیے اور وہ یہ کہ چھٹیوں کے دوران دھوپ میں نو دو گیارہ نہیں گھومیں' پہلے اسکول سے ملنے والا کام ختم کریں پھر کہیں کھیل کود یا سیر سپاٹے کا پروگرام بنائیں۔ گرمی اور سخت دھوپ سے بچیں' ٹھنڈی مٹھی چٹپٹی چیزیں نہ کھاتے پھریں' سر احباب کر دیکھیں اور صاف پانی خوب پئیں۔ ...... اللہ کریم آپ کو سلامت اور صحت مند رکھے۔ باقی باتیں ان شاءاللہ اگلے ماہ تک کے لیے اجازت دیجیے' اللہ نگہبان! (ایڈیٹر)

اس شمارے میں

درسِ قرآن	ڈاکٹر عبدالرؤف	2
[illegible]	[illegible]	4
[illegible]	سرور ...	6
[illegible]	نذیر انبالوی	7
[illegible]	[illegible]	12
[illegible]	[illegible]	13
[illegible]	[illegible]	20
[illegible]	محمد ادریس قریشی	21
[illegible]	[illegible]	27
[illegible]	[illegible]	31
[illegible]	[illegible]	33
[illegible]	[illegible]	39
[illegible]	[illegible]	41
[illegible]	[illegible]	45
[illegible]	[illegible]	46
[illegible]	[illegible]	49
[illegible]	[illegible]	54
[illegible]	[illegible]	56
[illegible]	[illegible]	64
[illegible]	[illegible]	71
[illegible]	[illegible]	72
[illegible]	[illegible]	77
[illegible]	[illegible]	79
[illegible]	[illegible]	83
[illegible]	[illegible]	84
[illegible]	[illegible]	89
[illegible]	[illegible]	93

سرورق "سالگرہ نمبر"

جون 2005ء

قیمت فی پرچہ 25 روپے

عبدالسلام

سعید لخت

سید شوکت اعجاز

ماہنامہ تعلیم و تربیت 32- ایمپریس روڈ' لاہور
U.A.N: 042-111-62-62-62 Fax: 042-6365...
Email: support@ferozsons.com.pk
website: http://www.taleemotarbiat.com

بچوں کے لئے

درسِ قرآن

ڈاکٹر عبدالرؤف

اللہ کے نیک بندے

قرآنِ حکیم ایک عظیم اور آخری الہامی کتاب ہی نہیں بلکہ علم و ادب اور تعلیم و تہذیب کا حسین ترین شاہکار بھی ہے۔ غیر معمولی مٹھاس، جامعیت اور اثر پذیری میں قرآن حکیم کا کوئی جواب نہیں۔

اللہ کے نیک بندوں کے بارے میں اگر آپ کہیں پارہ 19، سورہ 25 کی آیات 3 تا 67 پڑھیں تو آپ عش عش کر اٹھیں گے۔ ان میٹھی میٹھی عربی آیات کا اُردو ترجمہ ذیل میں پیش کیا جارہا ہے۔

"اللہ کے بندے وہ ہیں جو زمین پر عاجزی سے چلتے پھرتے ہیں۔ جب نادان لوگ ان سے مخاطب ہوں تو وہ کہتے ہیں: تم پر سلامتی ہو! وہ لوگ اپنے پروردگار کے آگے سجدے میں اور قیام میں راتیں گزارتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: "اے ہمارے پروردگار! دوزخ کا عذاب ہم سے دور رکھ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کا عذاب نری تباہی ہے۔ وہ واقعی برا ٹھکانا ہے۔ وہ لوگ جب خرچ کرتے ہیں تو نہ تو فضول خرچی کرتے ہیں اور نہ ہی کنجوسی بلکہ ان کا خرچ ان (دونوں انتہا پسند رویوں) کے بین بین ہوتا ہے"۔

یہ تو قرآنِ کریم کی ان دل آویز آیتوں کا ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔ اگر آپ کہیں انہیں اصل عربی عبارت کے ساتھ مطالعہ کریں تو لطف اندوزی اور اثرپذیری میں بدرجہا اضافہ ہوگا۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے جن نیک اور عمدہ باتوں کی تلقین کی ہے ان کی فہرست یوں مرتب ہوتی ہے۔

(1) انسان کی روزمرہ چال ڈھال میں عجز و انکساری اور وقار و خوبی ہونا ضروری ہے۔

(3) عبادت اور ذکرِ الٰہی سے غفلت نہیں ہونی چاہیے۔

(4) فضول خرچی اور کنجوسی دونوں بری حرکتیں ہیں۔ انسان کو اپنے اخراجات میں میانہ روی اختیار کرنی چاہیے۔ یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ اس قسم کے دل آویز قرآنی شاہکار غیر معمولی لطف اندوزی کے علاوہ انسان کو صحیح راستوں پر چلانے میں بھی بے حد تعمیری کردار ادا کرتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

شعر و ادب کے میدان میں حکیم افتخار فخر ایک معتبر حیثیت کے مالک ہیں۔
بچوں کے لیے لکھی ہوئی ان کی نظمیں خاص طور پر پسند کی جاتی ہیں۔

سالنامہ تعلیم و تربیت

حکیم افتخار فخر

بچوں کا سالنامہ "تعلیم و تربیت" ہے
ہاتھوں میں سب نے تھاما "تعلیم و تربیت" ہے
بچوں کی خوبصورت اس میں کہانیاں ہیں
علم و ادب کی جن میں ساری نشانیاں ہیں
علم و ہنر کے موتی بکھرے ہیں کاغذوں پر
سب خوش ہوئے ہیں ان کو ہاتھوں میں اپنے پا کر
اس میں لکھے لطائف سب کو ہنسا رہے ہیں
غم سے ہر آدمی کو جو دُور لا رہے ہیں
اہلِ نظر کی خاطر اس میں نصیحتیں ہیں
اور دوستوں کی خاطر بکھری محبتیں ہیں
ہے فخرؔ سالنامہ یہ نظم لکھ رہا ہوں
بچوں کی بات کر کے باتوں کو سوچتا ہوں

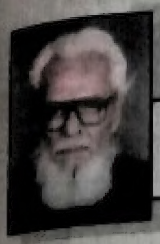

سلام اُن ﷺ پر

مسرور کیفی

نعت کے حوالے سے ان کا نام اور کام بہت معتبر ہے۔ محبت اور عقیدت میں ڈوبی ہوئی ان کی نعتیں ہر حلقے میں بے حد مقبول و معروف ہیں۔

سلام اُنؐ پر خدا کے بعد جو یکتا ہیں' اعلیٰ ہیں
سلام اُنؐ پر جو عظمت اور رفعت کا حوالہ ہیں

سلام انؐ پر جو محبوبِ خداوندِ جہاں بھی ہیں
سلام انؐ پر ہمارے جو' یہاں بھی ہیں وہاں بھی ہیں

سلام انؐ پر سلامت جن کے جلووں سے جہاں اپنا
سلام انؐ پر کہ جن کے نام سے نام و نشاں اپنا

سلام انؐ پر ملائک جن کے در پر روز آتے ہیں
درودوں کے' سلاموں کے جو نذرانے لٹاتے ہیں

سلام انؐ پر جنہوں نے آ کے سارے بتکدے ڈھائے
سلام انؐ پر جنہوں نے زندگی کے راز سمجھائے

سلام انؐ پر' سراپا جن کا آنکھوں میں سمایا ہے
سلام انؐ پر کہ جن کی رحمتوں کا ہم پہ سایہ ہے

سلام انؐ پر جو اُمت کو ہمیشہ یاد رکھتے ہیں
کرم سے' لطف سے' جود و سخا سے شاد رکھتے ہیں

سلام اُنؐ پر کہ جن کا ہم مسلسل نام لیتے ہیں
سلام اُنؐ پر کہ جو گرتے ہوؤں کو تھام لیتے ہیں

سلام اُنؐ پر جو دل کی آرزو بھی ہیں' تمنا بھی
سلام اُنؐ پر' ہمارا دین بھی ہیں اور دنیا بھی

رفعت: بلندی ملائک: فرشتے جود و سخا: سخاوت

بچوں کا ادب اور نذیر انبالوی دونوں ہم نام قرار دیے جا سکتے ہیں۔ قرآنی آیات اور احادیث نبویؐ کی روشنی میں ان کی لکھی ہوئی کہانیاں بچے خاص دلچسپی سے پڑھتے ہیں۔

نذیر انبالوی

بچّہ پارٹی زندہ باد

"سر! اگر ایسا ہو جائے تو ملک میں کوئی بچہ بھی ان پڑھ نہیں رہے گا"۔ حیات خان نے چہرے پر مسکراہٹ سجاتے ہوئے کہا۔

"ہم اس منصوبے کو ضرور عملی جامہ پہنائیں گے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ملک کا ہر بچہ پڑھا لکھا ہو۔ میرا خیال ہے' اس منصوبے ہی سے ایسا ممکن ہے"۔ سلطان عالم کی بات سن کر عمر آفتاب نے سوال کیا۔

"سر! یہ منصوبہ کب تک عملی شکل اختیار کرے گا؟"

"بہت جلد' میرا خیال ہے آئندہ چند ماہ میں یہ اسکیم شروع ہو جائے گی"۔

"سر! اگر میٹرک پاس کرنے والے ہر طالب علم اور طالبہ کے ساتھ ساتھ انٹر کرنے والوں کو بھی اس بات کا پابند بنایا جائے کہ جب تک وہ اپنے اردگرد کسی کو پڑھنا لکھنا نہیں سکھائیں گے ان کو پاس ہونے کی سند نہیں ملے گی"۔ حیات خان نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

"پہلے مرحلے میں اس کو میٹرک تک ہی رہنا چاہیے پھر اس کا دائرہ بڑھاتے رہیں گے۔ میں آپ لوگوں کی آمد کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ ہم بہت جلد اس حوالے سے دوبارہ میٹنگ کریں گے۔ آپ بھی اس منصوبے کے بارے میں سوچیں اور میں بھی اس پر غور کرتا ہوں"۔ سلطان عالم کے ان الفاظ کے ساتھ ہی ان پڑھ بچوں کی تعلیم کے لیے جاری اجلاس ختم ہو گیا۔ سب لوگ اپنی فائلیں بغل میں دبائے کمرے سے باہر آگئے۔ سب کے چہروں پر تھکاوٹ کے آثار تھے۔ حیات خان اسی تھکاوٹ کے ساتھ گھر پہنچے تو سروش نے انہیں دیکھتے ہی کہا:

"ابو جان! لگتا ہے ان دنوں دفتر میں خاصا کام ہے"۔

"ہاں بیٹا! ان دنوں بہت کام ہے' محکمے کے سربراہ اسلام آباد سے آئے ہوئے ہیں۔ آج ایک اہم میٹنگ تھی"۔

"میٹنگ میں کن امور پر بات ہوئی ہے؟" سروش نے سوال کیا۔

"دیگر امور کے ساتھ ساتھ اس بات پر غور کیا گیا کہ ملک میں ہر میٹرک پاس طالب علم اور طالبہ پر لازم کیا جائے کہ وہ جب تک کسی ایک ان پڑھ کو نہیں پڑھائے گا اس کو میٹرک کی سند نہیں دی جائے گی"۔

"کیا ایسا ہو سکے گا؟"

"ہاں ایسا ہو گا۔ اس حوالے سے مزید اجلاس ہوں گے۔ میرا خیال ہے' آئندہ تعلیمی سال سے اس منصوبے پر عمل شروع

ہو جائے گا"۔ حیات خان تو یہ کہہ کر اپنے کمرے میں چلے گئے مگر سروش کو سوچوں کے سپرد کر گئے۔ سروش نے میٹرک کے پیپرز دیئے ہوئے تھے۔ وہ سوچنے لگا کہ اگر اسے میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے لیے اس پابندی کا سامنا کرنا پڑتا تو وہ کیا کرتا۔ اس نے ذرا سا غور کیا تو اس پر ساری بات واضح ہو گئی۔ اس نے اپنی سوچ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے محلے کے بچوں کو شام کے وقت اپنے گھر بلا لیا۔ محلے کے لوگ سروش کے ان ساتھیوں کو "بچہ پارٹی" کے نام سے پکارتے تھے۔ بچہ پارٹی کے اجلاس سروش کے گھر کے علاوہ خوشنما باغ میں بھی ہوتے تھے۔ سروش ان بچوں میں سب سے بڑا تھا۔ آج جب سب بچے آ گئے تو سروش نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"آج کا اجلاس میں نے ایک اہم بات پر غور کرنے کے لیے بلایا ہے"۔

"وہ بات کیا ہے؟" ہارون نے پوچھا۔

"یہ کوئی اہم بات ہے۔ تم تو فارغ ہو ہم ابھی اسکول جا رہے ہیں"۔ وقار بولا۔

"چند دنوں کی تو بات ہے پھر ہم سب گرمیوں کی چھٹیوں کی وجہ سے فارغ ہوں گے"۔ سروش کی بات سن کر خلیق بولا۔

"گرمیوں کی چھٹیوں میں ہم کب فارغ ہوں گے۔ صبح کے وقت ٹیوشن پڑھنے جانا ہو گا۔ اس کے علاوہ میں تو سیر کے لیے کاغان بھی جاؤں گا"۔

"ٹیوشن پڑھنے کے لیے تم صرف دو گھنٹے کے لیے جاؤ گے اس کے بعد تو تم فارغ ہی ہو گے نا!"۔

"فراغت کہاں، چھٹیوں کا ڈھیروں کام بھی تو کرنا ہو گا"۔ شارق بولا۔

"ان سارے کاموں کے باوجود ہمیں ان بچوں کے لیے وقت نکالنا ہو گا جو پڑھنا تو چاہتے ہیں مگر ان کے وسائل اتنے نہیں ہیں کہ وہ پڑھ سکیں۔ ہم اس کام کا آغاز اپنے علاقے سے کریں گے۔ تم میں سے کون کون میرا ساتھ دے گا؟" سروش بولتا چلا گیا۔ خلیق کے علاوہ سبھی نے اپنے ہاتھ بلند کر دیئے۔

"ٹھیک ہے خلیق اگر ہمارا ساتھ نہیں دینا چاہتا تو کوئی بات نہیں۔ میں کل ہی ان بچوں کی فہرست بناتا ہوں جنہیں ہم نے تین ماہ کی تعطیلات کے دوران پڑھانے کی کوشش کرنی ہے۔ چھٹیوں کے شروع ہوتے ہی ہم اس کام کا آغاز کر دیں گے"۔

"بچوں کے لیے کتابوں، کاپیوں کا بندوبست کس طرح ہو گا؟" اعجاز نے پوچھا۔

"ان کا بندوبست میں کر لوں گا"۔ سروش نے جواب دیا۔

ابھی گرمیوں کی چھٹیاں ہونے میں ایک ہفتہ رہتا تھا۔ سروش

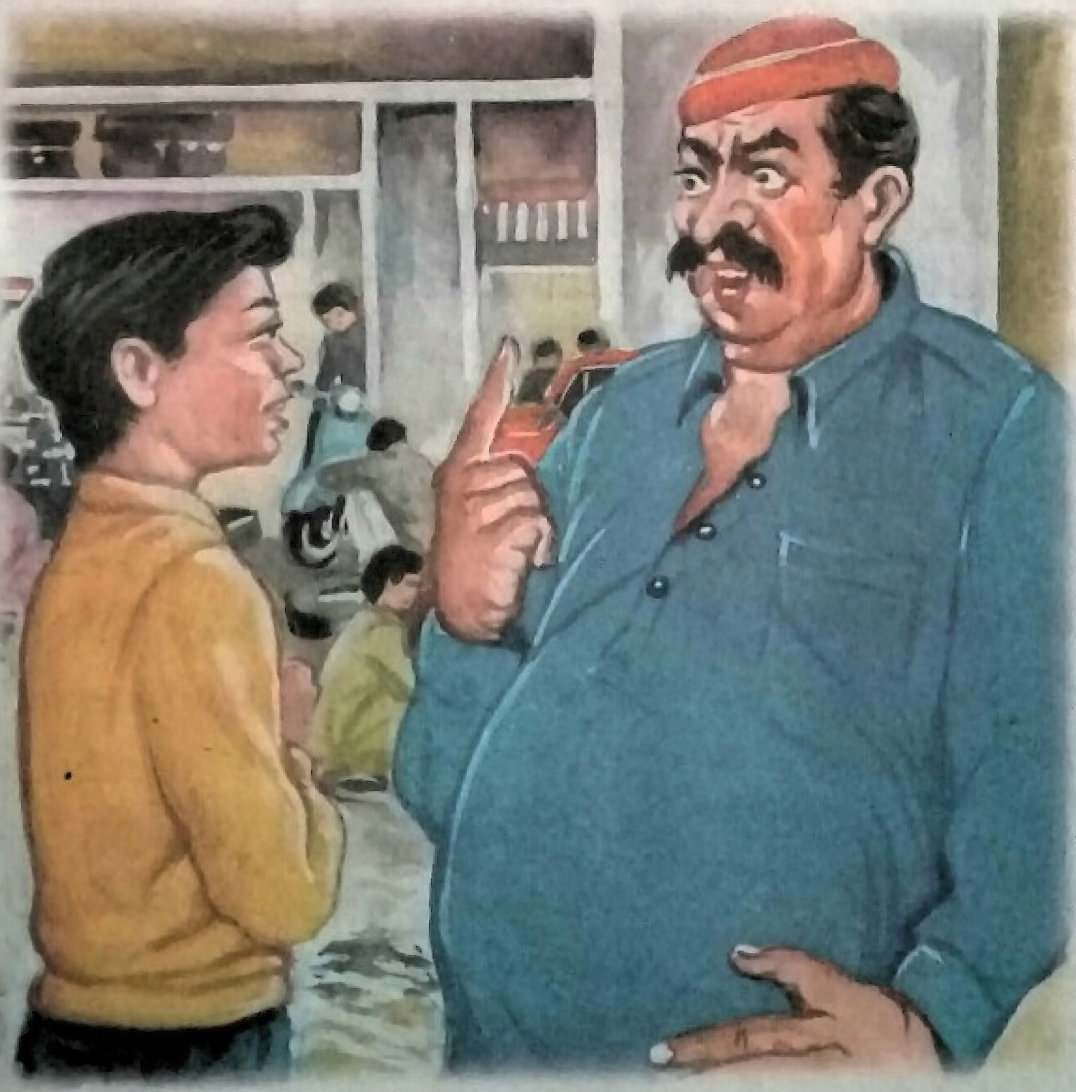

نے اپنے اردگرد نظر ڈالی تو اسے ایسے کئی بچے دکھائی دیئے جو اسکول نہیں جاتے تھے۔ ان کی کالونی کے پاس ایک ورکشاپ تھی۔ اس میں آٹھ سے بارہ سال تک کے کئی بچے کام کرتے تھے۔ ایک صبح وہ وہاں جا پہنچا۔ بڑی مونچھوں اور بڑی سی توند والا ایک ادھیڑ عمر آدمی اس کو دیکھتے ہی چلایا۔ "کیوں منہ اٹھائے چلے آرہے ہو؟"۔

"جناب' میں ایک کام سے آیا ہوں"۔

"بولو' کیا کام ہے؟"

"میں ان بچوں کو پڑھانا چاہتا ہوں"۔

"لو بھئی سنو' یہ تم لوگوں کو پڑھانے کے لیے آیا ہے"۔ استاد کی بات سن کر بچوں نے کام کرتے ہوئے سروش پر نظر ڈالی اور پھر اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ استاد نے سروش کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا:

"ان لوگوں نے پڑھنا ہی تھا تو پھر یہاں کام کیوں کرتے؟ یہ صرف کام کریں گے' جاؤ تم بھی اپنا کام کرو"۔

"مجھے ان سے بات تو کرنے دیں"۔ سروش نے آہستہ سے کہا۔

"کیوں کرنے دوں بات' چلو بھاگو یہاں سے؟" استاد کا لہجہ تلخ تھا۔

"تعلیم ان بچوں کا حق ہے۔ میں انہیں مفت تعلیم دوں گا"۔ سروش بولا۔

"جاتے ہو یا دوں ایک ہاتھ!"۔ استاد غرایا۔

سروش حسرت بھری نگاہوں سے ورکشاپ میں بچوں کو کام کرتے دیکھتا ہوا باہر آگیا۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اس کو ایسی صورت حال کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اب اس کے قدم مارکیٹ میں ایک چھوٹے سے ہوٹل کی طرف اٹھ رہے تھے۔ ہوٹل میں لوگوں کا رش تھا۔ سروش کو دیکھ کر ایک بچے نے پوچھا:

"کھانا کھاؤ گے یا چائے پینے کا ارادہ ہے؟"

"کچھ کھاؤں پیوں گا نہیں"۔

"کیا ہوٹل میں کیبل پر لگی فلم دیکھنے آئے ہو؟ چائے پیو گے تو یہاں بیٹھ سکو گے!"۔ بچے نے سروش کو گھورتے ہوئے کہا۔

> نفرت سے بڑا کوئی دشمن نہیں، محبت سے
> اچھا کوئی دوست نہیں اور اخلاق سے بڑی
> کوئی طاقت نہیں۔
>
> تدبر انبالوی
>
> ۱۷ مئی ۲۰۰۵ء

"میں اور میرے ساتھی تم جیسے بچوں کو تعلیم دینا چاہتے ہیں"۔ سروش فوراً مطلب کی بات پر آ گیا۔ "میں نے پڑھنا ہوتا تو اسکول سے کیوں بھاگتا۔ میں یہاں خوش ہوں"۔ بچے نے جواب دیا۔

ان کی باتوں کو ہوٹل کے مالک نے بھی سن لیا۔ اس کا رویہ بھی خاصا تکلیف دہ تھا۔ سروش یہاں سے بھی ناکام لوٹا۔ اب وہ ایک جنرل اسٹور کے سامنے کھڑا تھا۔ وہاں دو بچے تیزی سے کام میں مصروف تھے۔ جنرل اسٹور کے مالک نے اس کے آنے کا مدعا جان کر کہا:

"یہ صبح سے رات تک یہاں کام کرتے ہیں۔ میں ان کو معقول تنخواہ دیتا ہوں۔ ان کے پاس پڑھنے کے لیے وقت نہیں ہے۔ تم اپنا وقت ضائع مت کرو۔ یہاں تمہیں کچھ نہیں ملے گا"۔ یہ در بھی اس کی جھولی میں کچھ نہ ڈال سکا۔ تین دنوں کی کوشش کے باوجود اس کے ہاتھ کچھ نہیں آیا۔

شام کے وقت بچہ پارٹی کے اراکین خوشنما باغ میں موجود تھے۔ سروش نے ورکشاپ ہوٹل اور جنرل اسٹور کا احوال ان کو سنایا تو ہارون کہنے لگا:

"اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟"

"ہمیں غور کرنا پڑے گا کہ ہمیں ایسے بچے کہاں سے ملیں گے جنہیں ہم نے گرمیوں کی چھٹیوں میں تعلیم دینی ہے؟"۔ شارق بولا۔

"ہمیں اپنے گھروں میں دیکھنا پڑے گا"۔ وقار نے لقمہ دیا۔

"ہاں ہمارے ہاں جو ماسی کام کرنے کے لیے آتی ہے اس کے ساتھ اکثر سات آٹھ سال کا ایک بچہ بھی آتا ہے"۔ اعجاز نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"ہمارے گھر بھی کوڑا کرکٹ اٹھانے والے کے ساتھ

ایک بچہ بھی آتا ہے"۔ عدنان نے کہا۔

"میں اس سلسلے میں ان کے بڑوں سے بات کروں گا"۔ سروش نے کہا۔

جب گرمی کی چھٹیوں کا آغاز ہوا تو بچہ پارٹی کے پاس چار بچے تھے جنہیں انہوں نے پڑھنا لکھنا سیکھانا تھا۔ سروش کے پاس کچھ پرانے ابتدائی قاعدے تھے اور کچھ اس نے اپنے جیب خرچ سے خرید لیے تھے۔ خوشنما باغ صبح کے وقت کسی اسکول کا منظر پیش کرنے لگا تھا۔ اس اسکول میں طلبا کم اور اساتذہ زیادہ تھے۔ خلیق کے علاوہ سبھی بچے اپنی استطاعت کے مطابق ان بچوں کو پڑھاتے تھے۔ ایک ماہ میں ان بچوں کو حروف تہجی کی پہچان اور سو تک گنتی پڑھنا آگئی تھی۔ حروف تہجی کی پہچان کے بعد ان حروف سے الفاظ بنانے کا مرحلہ آیا۔ آغاز میں مشکل لگنے والا کام اب بچوں کو آسان محسوس ہو رہا تھا۔ بچہ پارٹی میں کل چھ بچے تھے۔ سروش نے بچہ پارٹی کا سربراہ ہونے کی وجہ سے ارادہ کیا تھا کہ وہ گرمیوں کی تمام تعطیلات میں ان بچوں کو پڑھائے گا جبکہ دو دو بچے پندرہ دنوں کے لیے سیر یا کسی عزیز کے ہاں جانا چاہیں تو وہ جا سکتے ہیں۔ اس طرح کچھ بچے اپنے نانا' نانی' دادا دادی کے ہاں ملنے ملانے بھی چلے گئے اور بچوں کی پڑھائی کا سلسلہ بھی چلتا رہا۔ دو ماہ میں زیر تعلیم بچے اس قابل ہو گئے تھے کہ حروف کو جوڑ کر مختلف چھوٹے چھوٹے لفظ آسانی سے پڑھ لیتے تھے۔ سروش کے ابو کئی دنوں سے اسلام آباد گئے ہوئے تھے۔ انہوں نے روانگی سے قبل بتایا تھا کہ بچوں کے لیے ان کا محکمہ جس منصوبے پر کام شروع کرنے والا ہے اس حوالے سے بہت اہم اجلاس ہو رہا ہے۔ جب وہ اسلام آباد سے واپس آئے تو سروش کے پوچھنے پر انہوں نے بتایا:

"بس اب کچھ ہی دنوں کی بات ہے پھر ورکشاپوں' ہوٹلوں' گھروں اور بازاروں میں کام کرنے والے بچے بھی پڑھ لکھ سکیں گے"۔

"ابو! اگر ایسا ہو جائے تو کتنا اچھا ہو"۔

"سروش بیٹا! ایسا ہی ہو گا۔ تم سناؤ بچہ پارٹی کا اسکول کیسا چل رہا ہے؟"

"بہت اچھا! اس اسکول میں پڑھنے والے طلبا میں اتنی لیاقت پیدا ہو گئی ہے کہ اب وہ چھوٹے چھوٹے جملوں کو آسانی سے پڑھ لیتے ہیں"۔

"بہت خوب"

"آپ کبھی ہمارے اسکول تو آئیں!"۔

"اجلاس ختم ہو جائے تو میں ضرور تم لوگوں کے اسکول آؤں گا"۔ اس کے ابو نے حامی بھرتے ہوئے کہا۔

ایک صبح خوشنما باغ میں پڑھائی جاری تھی کہ ورکشاپ میں کام کرنے والا ایک بچہ رب نواز وہاں آکر کھڑا ہو گیا۔ سروش کے اشارے پر وہ بچوں کے ساتھ بیٹھ گیا۔

"کیا پڑھنا چاہتے ہو؟" عدنان نے پوچھا۔

"جی ہاں! "آپ ایک مرتبہ میری ورکشاپ میں آئے تھے۔ میں آپ سے بات کرنا چاہتا تھا مگر استاد کے خوف سے ایسا نہیں کر سکا۔ مجھے چند روز قبل ہی پتا چلا تھا کہ خوشنما باغ میں آپ بچہ پارٹی کے تحت کام کرنے والے بچوں کو پڑھاتے ہیں۔ میرے کئی اور دوست بھی پڑھنا چاہتے ہیں۔ کیا میں ان کو بھی ساتھ لا سکتا ہوں؟"۔ رب نواز بولتا چلا گیا۔

"ہاں تم ان کو بھی ساتھ لا سکتے ہو"۔ سروش بولا۔

اب رب نواز اور اس کے دوست ورکشاپ جانے سے قبل صبح کے وقت بچہ پارٹی اسکول میں پڑھتے اور اپنے قاعدے کاپیاں سروش کے پاس ہی رکھ جاتے۔ رب نواز تین جماعتیں پہلے ہی پڑھا ہوا تھا اس لیے چند ہفتوں ہی میں وہ چھوٹے چھوٹے جملے لکھنے کے ساتھ حساب کے سوال بھی حل کرنے لگا تھا۔ وہ بچہ پارٹی اسکول میں پڑھ رہا ہے' اس راز سے اس وقت پردہ اٹھا جب ایک دن استاد کسی کام سے باہر گیا ہوا تھا۔ ورکشاپ میں ایک گاڑی کا کام مکمل ہو چکا تھا' صرف اس کا بل بننا باقی تھا۔ استاد کی عدم موجودگی میں گاڑی کا مالک آیا تو رب نواز نے بل بنا دیا۔ گاڑی کا مالک بل ادا کر کے گاڑی لے گیا۔ جب استاد واپس آیا تو سوزوکی مہران کو ورکشاپ میں نہ پا کر فوراً بولا:

"گاڑی کون لے گیا ہے؟"

"گاڑی کا مالک" رب نواز نے جواب دیا۔

"اور اس کا بل؟"۔

"بل میں نے لے لیا ہے"۔

"بل تو میں بنا کر نہیں گیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ شوکت صاحب شام تک آئیں گے"۔ استاد نے کہا۔

"مجھے پتا تھا کہ گاڑی میں کیا چیزیں نئی ڈالی گئی ہیں' اس لیے بل میں نے بنا لیا تھا"۔

"تم نے بل بنایا ہے' تم تو پڑھنا لکھنا نہیں جانتے؟"۔

"یہ بات پہلے درست تھی مگر اب نہیں۔ میں اب پڑھ لکھ سکتا ہوں۔ یہ بل دیکھ لیں"۔ استاد نے جب بل دیکھا تو وہ بالکل درست تھا۔ استاد نے پہلے بل اور پھر رب نواز کو حیرانی سے دیکھتے ہوئے پوچھا:

"کہیں اس لڑکے کے اسکول میں تو نہیں پڑھتے ہو جو یہاں آیا تھا؟"

"جی ہاں! اسی اسکول میں پڑھتا ہوں۔ اس کا نام بچہ پارٹی اسکول ہے"۔ رب نواز کی بات سن کر استاد کچھ سوچنے لگا۔

اگلی صبح استاد ورکشاپ میں کام کرنے والے تمام بچوں کو لے کر بچہ پارٹی اسکول میں موجود تھا۔ گرمیوں کی چھٹیاں ختم ہونے میں چند دن رہ گئے تھے۔ اب اس اسکول میں طلباء کی تعداد بیس سے زیادہ ہو چکی تھی۔ حیات خان اگرچہ اہم اجلاس میں مصروف تھے مگر اس کے باوجود انہوں نے بچہ پارٹی اسکول کے لیے وقت نکالا۔ انہوں نے خوشنما باغ میں ایک ایک بچے کو اپنے پاس بلا کر کچھ لکھوایا اور بچوں کی کارکردگی کی بے حد تعریف کی۔ بچہ پارٹی کے اساتذہ اپنی کامیابی پر بہت خوش تھے۔ اساتذہ سے تعارف کے دوران حیات صاحب نے خلیق کے بارے میں پوچھا تو سروش نے بتایا:

"وہ اس وقت کاغان کی سیر کر رہا ہے۔ اس نے ہمارا ساتھ دینے سے انکار کر دیا تھا"۔

"خلیق نے انکار کر کے اچھا نہیں کیا۔ نیکی کے اس کام میں اسے تم لوگوں کا ساتھ دینا چاہیے تھے۔ سورہ المائدہ میں اللہ کا ارشاد ہے کہ: "..... نیکی اور پرہیز گاری کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کیا کرو اور گناہ اور ظلم کی باتوں میں مدد نہ کیا کرو....." میں تم لوگوں کو نیکی کا یہ کام کرتے دیکھ کر جس قدر خوشی محسوس کر رہا ہوں اس کا اظہار لفظوں میں نہیں کر سکتا۔ ہم ابھی تک صرف اجلاس کر رہے ہیں اور پارٹی بچہ نے اس پر عمل بھی کر دکھایا ہے۔ میں اس سلسلے میں آپ کی ہر ممکن مدد کروں گا۔ آج سے بچہ پارٹی اسکول کی تمام کتابوں کاپیوں کے اخراجات میں برداشت کروں گا۔ بچہ پارٹی زندہ باد!"۔ بچوں نے حیات صاحب کی طرف سے ملنے والی حوصلہ افزائی کا شکریہ ادا کیا۔

گرمی کی چھٹیوں کے خاتمے پر بچہ پارٹی نے فیصلہ کیا کہ یہ اسکول چھٹیوں کے بعد بھی چلتا رہے گا اور ہفتہ وار چھٹی کے دن مختلف جگہوں پر کام کرنے والے بچوں کو تعلیم دی جائے گی۔

بچہ پارٹی اسکول کو قائم ہوئے آج دس برس بیت چکے ہیں۔ سروش اپنی تعلیم مکمل کر کے ایک کالج میں پڑھانے کے ساتھ ساتھ اس اسکول پر بھی بھرپور توجہ دے رہا ہے۔ اب تک اس اسکول سے بے شمار طلباء پڑھنا لکھنا سیکھ چکے ہیں۔ حیات صاحب کے محکمے میں اب بھی اجلاس جاری ہے اور نہ جانے کب تک جاری رہے۔ آپ بھی بچہ پارٹی اسکول کی شاخ اپنے علاقے میں کھولنا چاہتے ہیں تو خوشی سے کھولیں۔ اس نیک کام کا آغاز گرمیوں کی انہی چھٹیوں میں کر لیتے ہیں' کیوں کیا خیال ہے؟

☆☆☆

ملک کے معروف شاعر اور ادیب کرامت بخاری بڑوں کے لیے تو لکھتے ہی ہیں ان کی بچوں کے لیے تخلیق کردہ نظمیں بھی اپنی سادگی، سلاست اور جذبہ و آہنگ کے اعتبار سے اپنا جواب نہیں رکھتیں۔

بچّے

کرامت بخاری

خوشیوں کا سامان ہیں بچّے
ہر دل کا ارمان ہیں بچّے
ہر آنگن، ہر گھر کی رونق
گل بوٹے، گلدان ہیں بچّے
اللہ کی مخلوق کے اوپر
اللہ کا احسان ہیں بچّے
بچّوں والے یہ کہتے ہیں:
جسم ہیں بچّے، جان ہیں بچّے
آج کی ننھی منی دنیا
کل کا پاکستان ہیں بچّے

دنیا میں "سب سے میٹھا' سب سے عظیم اور سب سے حسین لفظ "ماں" ہے۔ دل کی گہرائیوں سے پھوٹنے والا ٹھنڈا میٹھا لفظ "ماں" سبھی کچھ ہے..... غم کے اندھیرے میں امید کی کرن' درد بھرے لمحات میں تسکین کا مرہم اور افلاس کی شب میں آس کی شمع۔ جو ماں سے محروم ہے گویا وہ ہر مسرت سے محروم ہے۔ ماں ایک مقدس روح ہے جو ہمیشہ ہم پر شفقت و محبت کے پھول برساتی ہے۔ ماں کی محبت اور مامتا کی شفقت میں رچی بسی یہ سچی اور زندگی آموز کہانی لے کر آرہے ہیں' ممتاز ادیب اور کہانی کار جناب نیاز علی بھٹی..... صرف اور صرف آپ کے لیے!

☆☆☆☆☆☆

"بھگوانے پتر رک جاؤ!"

ماں نے تہجد کی نماز ختم کر کے دعا کے بعد اندھیرے میں کسی سے کہا۔

"جی ماتا جی!" اندھیرے میں کسی نے جواب دیا۔

"دیکھ بیٹے! مجھے یقین ہے کہ تو بھگوانا ہی ہے!" ماں نے کہا۔

"جی ماتا جی' میں بھگوانا ہی ہوں!" اندھیرے ہی میں کسی نے تصدیق کی۔

"بیٹا..... تو پچھلے چار مہینوں میں کم از کم چار دفعہ اندھیری رات میں میری حویلی کی دیوار پھلانگ کر آیا ہے۔ یہ تو کوئی اچھی بات نہیں۔ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ تجھے کسی چیز کی تلاش ہے جو تجھے مل نہیں رہی؟" ماں نے اجنبی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"جی ماتا جی! آپ کا کہنا درست ہے..... لیکن آپ کو میرا نام کس نے بتایا؟" اجنبی نے جواب دیتے ہوئے پوچھا۔

"بیٹے' مجھے تو یہ بھی معلوم ہے کہ تیرا ایک ساتھی فلاں راہٹ پر گھوڑے کے ساتھ گنے کی فصل میں چھپ کر بیٹھا ہوا ہے اور تم دونوں فلاں راستے سے غیر قانونی طور پر بارڈر کراس کر کے آئے ہو"۔ ماں نے جواب دیا۔

"جی ماتا جی' آپ کی معلومات بالکل درست ہیں!" اجنبی نے کہا۔

"تو بیٹا مجھے' بتا مسئلہ کیا ہے؟ اگر تو چاہے تو میں لالٹین لیکر آتی ہوں۔ تو اپنی گمشدہ چیز تلاش کر لے۔ یا پھر مجھ پر اعتبار کر اور اپنا راز مجھے بتا دے تاکہ میں دن کے اجالے میں تیری گمشدہ چیز تلاش کرنے کی کوشش کروں۔ مگر دیکھ' آئندہ میری حویلی کی دیوار پھلانگ کر مت آنا۔ پچھلی دفعہ تم نے اندھیرے میں میرے ڈبو کی ٹانگ زخمی کر دی تھی" ماں نے اجنبی کو ہدایت کرتے ہوئے کہا۔

"ماتا جی' مجھے افسوس ہے کہ میری وجہ سے آپ کا ڈبو زخمی ہو گیا" اجنبی نے کہا۔

"اچھا اب تو مجھے اصل بات بتا!" ماں نے اجنبی سے پھر پوچھا۔

"ماتا جی! اصل میں تقسیم ہند کے وقت جب ہم یہ علاقہ چھوڑ کر گئے تھے تو میں نے اس کھرلی (جانوروں کے چارہ کھانے کی جگہ) کے کسی طرف ایک چیز چھپائی تھی۔ بس وہی ڈھونڈنے آتا ہوں۔ مگر وہ مل نہیں رہی۔ شاید کسی نے نکال لی ہے یا پھر مجھے جگہ کا صحیح اندازہ نہیں رہا"۔ اجنبی نے ماں کو تفصیل بتائی۔

"بس یہ بات ہے! تو فکر نہ کر' اب جا۔ سحر ہونے کو ہے۔ لوگ اٹھ گئے تو تیرے لیے یہاں سے نکلنا مشکل ہو جائے گا..... اور ہاں کل اسی وقت آنا۔ میں کوشش کروں گی کہ تمہاری چیز مل جائے"۔ ماں نے اجنبی کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"لیکن ماتا جی' آپ نے بتایا نہیں کہ آپ کو میرے نام کا کیسے پتا چلا؟" اجنبی نے پھر پوچھا۔

"کہہ دیا نا کہ اب تو جا' کل اسی وقت آکر آہستہ سے حویلی کا دروازہ کھٹکھٹانا" ماں نے اجنبی کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

دن چڑھے ماں نے نوکر کو بلایا اور کہا "بیٹے' یہ کھرلی گندی ہو گئی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ جانور بیمار پڑ جائیں۔ لہٰذا کدال لا اور اسے گرا دے۔ تاکہ اس جگہ نئی اور بڑی کھرلی بنائی جائے"۔ نوکر کدال لایا اور اس نے آناً فاناً کھرلی گرا دی اور زمین صاف کر دی۔ پھر ماں نے اسے کھیتوں پر بھیج دیا اور خود اندازے سے وہ زمین کھودنے لگیں۔ کوئی تین چار فٹ گہرا کھودنے پر کسی برتن کے ٹکرانے کی آواز آئی تو وہ خوش ہو گئیں..... آسمان کی طرف دیکھ کر دعا کی اور اللہ کا شکر ادا کیا۔

رات کو جب ماں نے تہجد کی نماز ختم کی تو دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ وہ دعا مانگتے ہوئے اٹھیں اور دروازہ کھول دیا۔

"پرنام ماتا جی!"۔ بھگوانے نے حویلی کے اندر آتے ہوئے ماں کو سلام کیا۔

"چارپائی پر بیٹھ جا بیٹے!"۔ بھگوانے سے کہتے ہوئے ماں خود ایک کمرے میں گئیں اور وہاں سے ایک بڑا سا پیتل کا دُونا (دودھ کا برتن جس میں کم از کم بیس کلو دودھ آسکتا تھا) اٹھا لائیں اور بھگوانے کو دیتے ہوئے کہا "بیٹے' یہ لے۔ مجھے دن کے اُجالے میں کھدائی کرنے سے یہی ملا ہے!"

بھگوانے نے برتن دیکھا تو بہت خوش ہوا اور اسے لیتے ہوئے کہا "ماتا جی آپ کا شکریہ..... آپ کو پتا ہے کہ اس برتن میں کیا ہے؟"

"جو کچھ بھی ہے۔ میرا خدا جانتا ہے یا تُو..... میں نے اسے کھولا تک نہیں کیونکہ یہ تیری امانت تھی اور امانت کو کھول کر دیکھنا بھی خیانت ہے"۔ ماں نے جواب دیا۔

پھر برتن کا منہ کھولتے ہوئے اور ماں کو دکھاتے ہوئے بھگوانے نے کہا۔ "ماتا جی یہ دیکھیں' اس میں سونے چاندی کے زیورات اور ڈھیروں روپے ہیں!"

"بیٹے تمہیں مبارک کہ تیری گمشدہ دولت مل گئی۔ ماں نے بھگوانے کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا اور پھر مصلّے پر دعا مانگنے کے لیے بیٹھ گئیں۔

"ماتا جی! میری خوشی اور خواہش ہے کہ اس میں سے آپ جتنی دولت اور زیورات لینا چاہیں' لے لیں"۔ بھگوانے نے کھلا برتن ماں کی طرف کرتے ہوئے کہا۔

"کیوں؟" ماں نے ذرا غصے سے کہا۔

"کیونکہ آپ نے مجھ پر احسان کیا ہے"۔ بھگوانے نے سر جھکاتے ہوئے جواب دیا۔

"کیسا احسان! یہ تیری دولت اور امانت ہے جو تیرے حوالے کر کے مجھے خوشی ہوئی ہے"۔ ماں نے کہا۔

"نہ ماتا جی پھر بھی....." بھگوانے نے ضد کی۔

"دیکھ پُتر ہماری دولت اور سب کچھ پاکستان ہے جس کے لیے ہمارے بزرگوں نے بے بہا قربانیاں دی ہیں۔

یہاں ہمیں آزادی' عزت اور سکون جیسی نعمتیں میسر ہیں۔ جو اس دولت سے (برتن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) بہت بہتر ہیں..... اب تو جا' صبح ہونے کو ہے" ماں نے بھگوانے سے کہا۔

"ماتا جی' آپ کا بہت احسان..... آپ حکم کریں' میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں"۔ اب بھگوانے نے ماں کے پاؤں کو ہاتھوں سے چھوتے ہوئے کہا۔

"ہاں ایک احسان کر دو' اگر دل مانے!" ماں نے اسے اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔

"ماتا جی آپ حکم کریں مجھے خوشی ہو گی!" بھگوانے نے ماں کے قدموں میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

"تمہاری بیوی ہے؟"

"جی' ماتا جی"

"اور بچے بھی؟" ماں نے پوچھا۔

"بھگوان کی کرپا سے ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہے"۔

"تو پھر وعدہ کر کہ تو آئندہ کسی حالت میں بھی غیر قانونی طور پر بارڈر کراس نہیں کرے گا..... ذرا سوچ' اگر غیر قانونی طور پر بارڈر کراسنگ میں تجھے کوئی گولی مار دے تو پھر تیری بیوی اور بچوں کا کیا بنے گا"۔ ماں نے اسے سمجھایا۔

"ٹھیک ہے ماتا جی..... آئندہ ایسا نہیں کروں گا۔ یہ میرا آپ سے وچن (وعدہ) ہے"۔ بھگوانے نے جواب دیا۔

"اور یہ بھی وعدہ کر کہ تو ہر قسم کی غیر قانونی اور غیر اخلاقی حرکتوں سے باز رہے گا"۔ ماں نے اسے مزید ہدایت کی۔

ماتا جی' آپ کا حکم سر آنکھوں پر..... بھگوانے نے سر جھکا کر جواب دیا۔

"بیٹے دیکھ' میرے خدا نے تجھے تیری گمشدہ دولت واپس دے دی ہے۔ اس کا شکر کر اور اب یہ دولت تو کاشتکاری یا کاروبار میں لگا۔ بچوں کو تعلیم دلوا اور بیوی کو سکھ دے تاکہ وہ تجھے دعائیں دیں اور تجھے یاد رکھیں"۔ ماں نے اسے مزید سمجھایا۔

بھگوانا اب سر جھکائے کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اس نے روتے روتے کہا: ماتا جی! کاش آپ مجھے پہلے مل گئی ہوتیں تو میں بڑا انسان نہ بنتا۔ اب آپ بھی میرے لیے بھگوان سے دعا کریں کہ وہ میری مدد کرے اور پھر میں قانونی طور پر بمع بیوی بچوں کے دوبارہ آپ کی قدم بوسی کے لیے آسکوں"۔

"میرا خدا تیری مدد کرے گا۔ کیونکہ یہ اس کا وعدہ ہے کہ جو انسان اپنی مدد خود کرتا ہے' خدا بھی اس کی مدد کرتا ہے..... اب تو جا اللہ کے حوالے" ماں نے بھگوانے کے سر پر دوبارہ دستِ شفقت پھیرتے ہوئے کہا۔

"اچھا ماتا جی..... آپ کا بہت شکریہ..... ہاں' ڈبو کا کیا حال ہے؟ اس سے میری طرف سے معافی مانگیں"۔ بھگوانے نے کہا اور پھر وہ رات کے اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

ہوا کچھ یوں کہ پاکستان بننے کے بعد والد صاحب کو فوجی خدمات کے سلسلے میں بارڈر ایریا میں جو ایک مربع زمین ملی وہ بھگوانے کی تھی۔ ساری زمین زرخیز اور صاف تھی جس میں راہٹ اور بہت اچھی فصل لگی ہوئی تھی۔ علاوہ ازیں بہت سارے شیشم اور کیکر کے درخت بھی تھے۔ بڑی بات یہ تھی کہ یہ زمین گاؤں سے بہت نزدیک تھی۔ اس طرح گاؤں میں بھگوانے کی حویلی بھی ہمیں الاٹ ہو گئی۔ حویلی بہت بڑی تھی۔ جس میں دو کمروں اور ایک برآمدے پر محیط ایک بڑا سا کچا مکان تھا۔ اس کے آگے چونترہ (کھانا پکانے کی جگہ) اور بہت کھلی جگہ تھی۔ ایک نکڑ پر مویشیوں کے لیے دو کچے کمرے اور چارہ وغیرہ رکھنے کی جگہ تھی۔ حویلی میں بڑ کا بہت بڑا درخت تھا جس کی شاخیں سارے گھر پر پھیلی ہوئی تھیں۔

کہتے ہیں کہ بھگوانا ایک خوبصورت گھبرو جوان تھا مگر تھا کچھ غلط قسم کا جس کی تقسیم سے پہلے علاقے میں بہت دہشت تھی۔ تھانے میں اس کے خلاف چوری' ڈکیتی' رسہ گیری وغیرہ کے کئی

مقدمے درج تھے۔ پاکستان بننے پر وہ اپنے بیوی بچوں سمیت ہندوستان چلا گیا اور پھر ہمارا خاندان اس حویلی میں آ گیا۔

ایک رات جب تیز بارش ہو رہی تھی اور باہر سخت سردی تھی تو ایک پلّا (کتے کا بچہ) کسی طرح ہمارے مویشیوں کے باڑے میں گھس گیا۔ صبح جب نوکر نے باڑے کا دروازہ کھولا تو پلّے کو دیکھ کر ٹھٹکا۔ وہ بڑی مشکل سے کوئی دس دن کا ہو گا۔ وہ سردی سے ٹھٹھرا ہوا "کوں کوں" کر رہا تھا اور قریب المرگ تھا۔ ماں کو پتا لگا تو فوراً پلّے کو باڑے سے اٹھایا' صحن میں ایک پرانا کمبل بچھا کر اسے دھوپ میں لٹا دیا اور آدھا کمبل اس کے اوپر دے دیا۔ پھر جلدی سے برتن میں گڑ دودھ ڈال کر اس کے آگے رکھا مگر اس نے دودھ نہ پیا۔ کمبل اور دھوپ نے اس پر اثر کیا اور وہ گرم ہو کر سو گیا۔ پھر کہیں شام کو "کوں کوں" کرتا ہوا اٹھا جیسے کہہ رہا ہو: "بھوک لگی ہے"۔ جونہی پلّے نے "کوں کوں" کی' ماں نے اس کے سامنے دودھ رکھ دیا۔ اب کی بار اس نے سارا دودھ پی لیا اور دوبارہ کمبل میں گھس کر لیٹ گیا۔ ماں نے پلّے کو سردی سے بچانے کی خاطر اسے رات کو لا کر اپنی چارپائی کے نیچے بھُس اور کمبل کا بستر بنا کر لٹا دیا اور اسے کہا "ڈبو' گند نہیں ڈالنا"۔

کتے کے بچے کا "ڈبو" نام ہم سب کو پسند آیا۔ ویسے بھی ڈبو کے بدن پر کالے اور سفید داغ تھے۔ یعنی وہ "بلیک اینڈ وائٹ" تھا۔

خوراک اور آرام سے ڈبو دس پندرہ دن میں بالکل ٹھیک ہو گیا۔ اب جو بھی اسے ڈبو کہہ کر پکارتا۔ وہ فوراً دم ہلاتا ہوا آتا اور پاؤں میں لوٹنے لگ جاتا۔ ہمارے لیے تو وہ ایک اچھا فیلڈر بھی تھا کیونکہ جب بھی ہم کھدو گھنڈی (دیہات کا ایک کھیل جسے آپ ہاکی کی ابتدائی شکل سمجھ لیں) کھیلتے تو وہ بھاگ کر جاتا' گیند منہ میں پکڑتا' لا کر ہمیں دیتا اور ساتھ ہی بھونکتا جیسے کہہ رہا ہو: "کوئی گول تو نہیں ہوا!" اسی طرح جب ہم گلی ڈنڈا کھیلتے تو وہ دور سے گلی اٹھا لاتا اور ہمیں دیتا۔

ڈبو خاص کر ماں کے ساتھ ساتھ رہتا۔ وہ جب بھینس کا دودھ دوہنے لگتیں تو وہ ان کی بائیں طرف بیٹھ جاتا اور جب تک کہ ماں دودھ کی ایک دو دھاریں ڈائریکٹ بھینس کے تھنوں سے اس کے منہ پر نہ مار دیتیں وہ وہیں چپکے سے بیٹھا رہتا۔ پھر وہ منہ کو چاٹتے ہوئے "کوں کوں" کرتا ہوا وہاں سے ہٹ جاتا اور دور ہو کر بیٹھ جاتا۔ اسی طرح جب ماں کھانا پکاتی تو وہ اپنے اگلے پاؤں پر منہ رکھ کر چونترے کے ساتھ نیچے بیٹھ جاتا۔ ہم اسے روٹی ڈالتے تو وہ خوشی سے کھاتا۔ ماں بھی ڈبو کے لیے ایک علیحدہ نکی پکاتیں اور اسے دودھ لسی بھی دیتیں۔

زمینداروں کے گھروں میں بھیڑ بکریاں عام ہوتی ہیں۔ جب روپے پیسے کی ضرورت پڑتی تو وہ انہیں بیچ کر گذارہ کرتے ہیں۔ کچھ دنوں بعد ہماری ایک بھیڑ نے نر بچہ دیا جس کا بدن سفید اور اس پر کالے داغ تھے یعنی وہ بھی بلیک اینڈ وائٹ تھا۔ ماں نے اس کا نام پیار سے "ڈبہ" رکھ دیا اور اسے قربانی کے لیے بھی نامزد کر دیا۔

ڈبو نے جب ڈبے کو دیکھا تو بہت حیران ہوا کہ رنگ کا تو وہ بھی بلیک اینڈ وائٹ ہے مگر اس کی نسل اور قسم اور ہے۔ اس کی بولی بھی "میں میں" تھی جب کہ ڈبو اب بھونکنے بھی لگا تھا۔ بہرحال ڈبو خوش تھا کہ چلو کھیلنے کو کوئی ہم جنس تو ملا۔

خدا کی کرنی کہ ابھی ڈبہ دس دن کا بھی نہیں ہوا تھا کہ اس کی ماں مر گئی۔ جانوروں میں ایک بیماری ہوتی ہے منہ کھلا' اور گل گھوٹو جس سے ان کے سموں کے نیچے پیپ پڑ جاتی ہے' منہ میں چھالے اور آخرکار گلا بند ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ان بیماریوں کی وجہ سے وہ جانور خوراک کھا سکتا ہے اور نہ چل پھر سکتا ہے۔ ڈبے کی ماں کو بھی شاید یہ بیماریاں ہو گئیں۔ نوکر نے کافی دیسی علاج کیے مگر وہ تین چار دن میں ہی مر گئی اور یوں ڈبہ یتیم ہو گیا۔

ہمیں بہت افسوس ہوا۔ مگر ڈبے کی حالت تو ناقابل دید تھی۔ وہ سارا دن اور ساری رات "میں' میں" کرتا رہتا۔ کبھی وہ حویلی کی ایک نکڑ اور کبھی دوسری نکڑ کی طرف "میں میں' ماں ماں" کرتے دیکھتا رہتا مگر مایوس ہو کر لوٹتا اور پھر سر جھکا کر بیٹھ جاتا۔ اس نے دو دن سے کچھ کھایا پیا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ڈبو بھی "کوں کوں" کرتا اس کے پاس بیٹھ جاتا جیسے کہہ رہا ہو: "میری بھی ماں نہیں ہے۔ چلو دونوں تمہاری ماں کو تلاش کرتے ہیں!"..... مگر جانے والی نے کب آنا تھا!

ماں نے یہ حالت دیکھی تو ڈبے کو پکڑ کر زبردستی چیچ کے

ساتھ اسے دودھ پلایا۔ ایک چمچ، دو چمچ..... پھر آہستہ آہستہ ماں نے اس کے آگے دودھ اور لسی رکھنی شروع کی اور وہ پی جاتا۔ کوئی ایک ہفتہ ڈبے پر بھاری گزرا۔ وہ دودھ پیتے پیتے ادھر ادھر دیکھنے لگتا جیسے اپنی ماں کو یاد اور تلاش کر رہا ہو! پھر ڈبو بھی اس کے ساتھ گم سم ہو کر بیٹھ جاتا شاید اسے بھی اپنی ماں یاد آجاتی جو پتا نہیں کہاں تھی۔ زندہ بھی ہے یا نہیں! مگر کہتے ہیں کہ خداسب کو صبر دینے والا ہے۔ یوں ڈبے کو بھی خدا نے صبر دے دیا اور وہ مہینے بھر کے بعد شاید اپنی ماں کو بھول گیا!

اب "ڈبہ اور ڈبو" دونوں دوست بن گئے تھے۔ وہ سارا دن حویلی میں دوڑتے اور کھیلتے رہتے۔ جب تھک جاتے تو ماں کے دائیں بائیں آکر بیٹھ جاتے۔ جب وہ بھینس کا دودھ دوہنے بیٹھتیں تو ڈبو کے ساتھ اب ڈبہ بھی ماں کے دائیں طرف آکر بیٹھ جاتا۔ ماں کھانا پکاتیں تو اب ڈبو کے ساتھ "ڈبہ" بھی چبوترے پر موجود ہوتا فرق صرف یہ تھا کہ ڈبہ چبوترے کے اوپر ماں کی پیڑھی کے ساتھ اور ڈبو نیچے چبوترے کے ساتھ دونوں پاؤں پھیلا کر بیٹھ جاتا۔ ہم سب دونوں کو روٹی ڈالتے اور ماں دونوں کے لیے علیحدہ علیحدہ ٹکی بھی پکاتیں۔ ڈبہ اور ڈبو رات کو ماں کی چارپائی کے نیچے دائیں اور بائیں لیٹ جاتے۔ مگر کیا مجال کہ گند ڈالیں۔ ہاں صبح فجر کے وقت دونوں ضرور "کوں کوں" اور میں میں کرتے اور ماں ان کے لیے دروازہ کھول دیتیں۔ پھر تقریباً آدھے گھنٹے بعد دونوں آکر ماں کے پاس دائیں اور بائیں بیٹھ جاتے اور وہ دودھ بلونے لگتیں۔ اس کے بعد وہ دونوں کو علیحدہ علیحدہ برتن میں لسی ڈالتیں اور کبھی کبھار مکھن بھی انہیں دیتیں۔

ماں جب کبھی چرخہ کاتنے بیٹھتیں تو دونوں اس کے اردگرد بیٹھ کر چرخے کی گونج میں سو جاتے۔ ماں جب تک انہیں روٹی وغیرہ نہ ڈال دیتیں خود کھانا نہیں کھاتی تھیں۔

جمعہ کے روز جب ماں نوکرانی کے ساتھ کپڑے وغیرہ دھونے رہٹ پر جاتیں تو وہاں ڈبے اور ڈبو کو بھی مل کر نہلاتی اور وہ دونوں بھی ہفتے کے ہفتے ہلکے پھلکے اور صاف ستھرے ہو کر بہت خوش ہوتے۔

ایک دن کیا ہوا کہ ماں کھیتوں کو جارہی تھیں۔ میں، ڈبہ اور ڈبو بھی ان کے ساتھ تھے۔ میرے پاس ایک کھدو (کپڑے کا بنا ہوا گیند) تھا۔ میں نے اسے زور سے پھینکا تو ڈبو فوراً گیا اور منہ میں اٹھا کر واپس لے آیا۔ میں نے پھر پھینکا تو وہ بھاگا اور گیند واپس اٹھا لایا۔ اب ڈبے سے بھی نہ رہا گیا۔ لہٰذا تیسری بار جو میں نے گیند دور پھینکا تو وہ بھی بھاگا اب ڈبو اور ڈبے میں کشمکش شروع ہو گئی۔ خیر گیند تو ڈبو ہی منہ میں لایا مگر اس چھینا جھپٹی میں کہیں اس کا دانت

بادل نخواستہ "ڈبے کی ٹانگ پر لگ گیا اور اس نے واپس آنے کے بجائے وہیں کھڑے کھڑے "میں..... میں" کرنی شروع کر دی۔

میں نے اور ماں نے جا کر دیکھا تو ڈبے کی ٹانگ سے خون بہہ رہا تھا اور وہ تکلیف سے "میں میں" کر رہا تھا۔ "ڈبو' علیحدہ کھڑا حیران و پریشان تھا کہ اسے کیا ہوا! خیر ماں نے جلدی سے اپنے دوپٹے سے ایک ٹکڑا کاٹا اور ڈبے کی ٹانگ پر باندھ دیا پھر اسے گود میں اٹھا لیا کیونکہ ڈبے سے چلا نہیں جا رہا تھا۔ ماں نے ڈبو کو کہا: "دیکھ ڈبو' تو نے ڈبے کو کاٹا ہے۔ بہت بری بات" لیکن شاید اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا لہٰذا وہ بھی خاموشی سے کان لٹکائے ہمارے ساتھ واپس گھر آ گیا۔

گھر آ کر ماں نے جلدی سے ڈبے کا زخم صاف کیا۔ اس پر ہلدی وغیرہ لگا کر پٹی باندھی۔ پھر اسے ایک جگہ بٹھا دیا اور وہیں اسے کھانا اور چارہ وغیرہ دیا۔

اب ڈبو کو احساس ہوا کہ ڈبے کے ساتھ کوئی معاملہ ضرور ہے! اس نے کافی دفعہ "کوں کوں" اور "بھوؤں بھوؤں" کرتے ہوئے ڈبے کے گرد چکر لگائے جیسے کہہ رہا ہو" اٹھو' یار کھیلیں۔ مگر جب ڈبہ نہ اٹھا تو وہ بھی ہمت ہار کر اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ یوں جب تک ڈبہ ٹھیک نہ ہو گیا گھر میں قدرے خاموشی رہی۔

ماں ڈبے کی ہر روز پٹی کرتی اور ڈبو پاس بیٹھے حیرانی سے یہ کارروائی دیکھتا رہتا۔

ایک دن دیکھا کہ ڈبو اپنا سر ڈبے کے پاؤں سے رگڑ رہا ہے اور بھونک بھی رہا ہے جیسے کہہ رہا ہو: "معاف کر دے یار! مجھ سے بھول ہو گئی' میں نے جان بوجھ کر تو تمہیں نہیں کاٹا۔ اب کھیل کود میں کہیں میرا دانت لگ گیا تجھے تو اس میں میری تو غلطی نہیں!" پھر ہماری حیرانی کی حد نہ رہی جب ڈبے نے بھی اپنا سر ڈبو کے سر کے ساتھ رگڑنا شروع کیا جیسے وہ اسے معاف کر رہا ہو۔ اس طرح کوئی ایک ہفتہ لگا ڈبے کو ٹھیک ہونے میں۔

ایک دن کیا ہوا کہ ماں چونترے پر بیٹھی کھانا پکا رہی تھیں اور ڈبو اور ڈبہ ایک دوسرے سے الجھ رہے تھے۔ دراصل ڈبہ حسب عادت چونترے پر چڑھ کر ماں کے پاس بیٹھنے کی کوشش کر رہا تھا جبکہ ڈبو اسے روک رہا تھا۔ آخر جب ڈبے نے "میں میں" کی تو ماں نے ڈبو سے کہا چھوڑ دے اسے' آنے دے میرے پاس"۔ یوں ڈبہ ماں کے پاس آ کر پیڑھی کے نزدیک بیٹھ گیا اور "میں میں" کرنے لگا جیسے اب ڈبو کو چڑا رہا ہو! دوسری طرف ڈبو ناراض ہو کر چونترے سے پرے چلا گیا۔ پھر جب ہم نے اسے روٹی پھینکی اور ماں نے بھی ٹکی پکا کر اسے دی تو اس نے کھانے سے انکار کر دیا۔

"اچھا تو ڈبو ناراض ہے"۔ ماں نے اسے پکارتے ہوئے کہا۔

ڈبو نے بھوؤں بھوؤں کر کے جواب دیا جسے کہہ رہا ہو:

"ہاں میں ناراض ہوں۔ یہ کیا انصاف ہے کہ ڈبہ چونترے پر اور ڈبو چونترے سے نیچے! میں اس گھر میں پہلے آیا تھا۔ لہٰذا میرا حق پہلا ہے..... اور آپ کو یہ حق دینا ہو گا....."

ماں نے پھر کہا: "دیکھ ڈبو یہ ڈبہ پاک اور حلال جانور ہے اور قربانی کے لیے نامزد بھی..... تیرے چونترے پر آنے سے جگہ....."

اب ڈبہ پھر میں میں کرنے لگا جیسے ڈبو کو جتا رہا ہو کہ وہ نجس ہے۔ اس کی حیثیت ہی کیا ہے..... میں تو انسان پر قربان ہو جانے والا ہوں' جبکہ وہ نجس اور ناپاک.....! "ڈبو سے بھی نہ رہا گیا اور" بھوں بھوں" کرتا ہوا وہاں سے ہٹ گیا۔ جیسے کہہ رہا ہوں "مالکن! سمجھا لیں اس ڈبے کے بچے کو۔ اسے یہ تو بتائیں کہ اصحاب کہف کی رکھوالی کرنے والا کوئی ڈبہ نہیں تھا بلکہ مجھ جیسا ایک ڈبو تھا۔ جو ان کے غار کے دہانے پر اپنی دونوں ٹانگیں پسار کر ان کی حفاظت کرنے لیٹ گیا تھا اور جس کا ذکر قرآن مجید میں بھی ہے۔ تو کیا میں واقع نجس ہوں؟"

جب ماں نے دیکھا کہ ڈبو ناراض ہو گیا ہے۔ تو اسے پکارتے ہوئے روٹی ڈالی: "تو کھانا تو کھا!" مگر ڈبو ناراضگی سے "کوں کوں" کرتا ہوا چونترے سے دور جا بیٹھا' جیسے کہہ رہا ہو: "ایسی بے عزتی کی روٹی کا کیا فائدہ۔ اس سے بہتر ہے کہ بندہ عزت سے بھوکا رہ لے"۔

یہ دیکھ کر ماں نے کہا کہ چلو ایسا کرتے ہیں کہ کھانا پکانے کے وقت جو چونترے پر پہلے چڑھ آئے وہ میرے پاس بیٹھے اور دوسرا چونترے کے نیچے"۔ "یہ سننا تھا کہ ڈبو نے خوشی سے دم ہلائی جیسے کہہ رہا ہو: "ہاں یہ ٹھیک ہے" اور پھر روٹی کھانا شروع کی۔

بعد میں ہوا یہ کہ ڈبہ کھانا پکانے کے وقت اور ماں کے آنے سے ایک گھنٹہ پہلے ہی چونترے پر آکر بیٹھ جاتا! پھر جب بعد میں ڈبو آتا تو اس کو چونترے پر بیٹھا دیکھ کر بہت شور مچاتا۔ جیسے کہہ رہا ہو یہ فاؤل ہے۔ یہ ڈبہ تو چونترے سے نیچے اترتا ہی نہیں"۔

آخر کار وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ دونوں نے اپنی اپنی شرعی حیثیت مان لی۔ اب ڈبہ' ہمیشہ چونترے پر ماں کی پیڑھی کے پاس بیٹھتا اور ڈبو نیچے۔ ویسے بھی اب دونوں سیانے ہو گئے تھے اور اپنے دکھ بھول گئے تھے!

"ڈبے اور ڈبو" کی ماں سے انسیت اور دوستی کچھ زیادہ ہی تھی۔ جب تک ماں ان کے سامنے گھر میں موجود نہ ہوتی۔ وہ کھانا نہیں کھاتے تھے۔

(باقی آئندہ)

☆☆☆☆☆☆

نیاز علی بھٹی

جناب نیاز علی بھٹی بچوں کے معروف ادیب ہیں۔ ان کی کہانیاں نہایت دلچسپ' سادہ سبق آموز ہونے کی وجہ سے بڑے شوق سے پڑھی جاتی ہیں۔

سنہری باتیں

☆ اللہ کا خوف دانائی کی اصل بنیاد ہے۔ ☆ گزرا ہوا وقت ہاتھ نہیں آتا۔

☆ بہت بولنے والے کام تھوڑا کرتے ہیں۔ ☆ عقلمند سوچ کر بولتا ہے اور بے وقوف بول کر سوچتا ہے۔

☆ علم مال و دولت سے ہر حال میں بہتر ہے۔ ☆ غصہ فساد کی جڑ ہے۔

☆ عبادت نصف علم اور ملنساری نصف عقل ہے۔ ☆ اخراجات میں میانہ روی معاشی مسئلہ نصف رہ جاتا ہے۔

☆ مسکراہٹ دلوں کو جیتنے کا ایک ذریعہ ہے۔ ☆ مسکراہٹ شخصیت میں وقار پیدا کرتی ہے۔

(محمد عثمان عابد' کراچی)

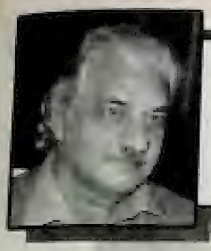

ناصر زیدی ملک کے معروف دانشور اور ممتاز شاعر ہیں۔ نظم و نثر' دونوں میں انہوں نے بچوں کے لیے بہت لکھا اور خوب لکھا۔ "تعلیم و تربیت" کے ننھے قارئین ان کی نظمیں خاص طور پر بے حد پسند کرتے ہیں۔

ناصر زیدی

پیارا وطن

سبز پرچم ہے' چاند تارا ہے
شادماں جس سے ملک سارا ہے
عزم و ہمّت سے' ہم نے دنیا پر
ایک نقشہ نیا ابھارا ہے

چار صوبے ہیں اور ہے کشمیر !
جن سے بنتی ہے ایک ہی تصویر
جاں فروشوں کا' پاک بازوں کا'
یہ وطن ہے' بلاشبہ جاگیر !

اس وطن کو سنبھالنا ہو گا
فکرِ قائدؒ میں ڈھالنا ہو گا
معتدل رہ کے' اگلی نسلوں کو
روشنی سے اُجالنا ہو گا

یہ وطن امن کا ہے گہوارا
کتنا اچھا ہے' سارے کا سارا

شادماں: خوش
پاکباز: اچھے لوگ
جاں فروش: جان قربان کرنے والے
معتدل: متوازن

"ٹھک ٹھک..... ٹھکا ٹھک....." چچا حیرت ایک چٹائی پر ہاون دستہ لیے بیٹھے تھے اور کوئی دوا کوٹ رہے تھے۔

"ابے عیدے، کہاں مر گیا۔ یہ عناب کا ڈبہ پکڑا اور شیدے تم تو ہو ہی انتہائی فضول، وہ گل قند کا مرتبان میرے قریب کرو"۔

عیدے نے الماری سے ڈبہ اٹھایا اور چٹائی کے کونے سے الجھ کر گر پڑا۔ سارے کمرے میں عناب بکھر گئے۔

"کوئی بات نہیں حیرت یار، تم نے سنا نہیں کہ ڈُلھے بیراں دا کجھ نئیں وِگڑیا یعنی (بیر اگر بکھر بھی گئے ہیں تو کچھ نہیں بگڑا، دوبارہ اکٹھے کیے جا سکتے ہیں)"۔ شیدا گنگنایا۔

"تم چپ رہو اور وہ دیکھو، ہاضمے کی پھکی کا لفافہ ایک چوہا کتر رہا ہے، حیرت ہے"۔ چچا بولے۔

"کیا کریں حیرت یار، ہمارے دفتر میں چوہوں کی بہتات ہو گئی ہے"۔ عیدے نے کہا۔

"ہُرا..... زندہ باد..... آئیڈیا"۔ شیدا پاگلوں کی طرح چیخا۔

"کیوں تمہیں کیا ہوا، بے وقتے کہیں کے"۔ چچا نے منہ بنایا۔

"آئیڈیا یہ ہے کہ یہ چوہا ہمارے مطب کا پہلا مریض ہے۔ اس بے چارے کا معدہ الابلا کھا کر خراب ہو گیا ہو گا، لہٰذا یہ یہاں تشریف سمیت چلا آیا"۔ شیدے نے چوہے کی طرف اشارہ کیا۔ "جی چاہتا ہے کہ موسل مار کر تم دونوں کا سر پھاڑ دوں۔ چوہے کو بھگانے کے بجائے فلسفے بھگار رہے ہو۔ ادھر یہ دوا نہیں کوٹی جا رہی۔ لگتا ہے صحیح طور سے خشک نہیں ہوئی"۔ چچا غصے سے بولے۔

اسی وقت دروازے پر ایک آدمی نظر آیا۔ "کیا بڑے حکیم صاحب بیٹھے ہیں؟"

"ہاں ہاں بلکہ اکڑوں بیٹھے ہیں، آپ بتائیے، آپ کو کیا تکلیف ہے؟" عیدے نے کہا۔

"کیا کہا..... تکلیف؟" اس نے برا سا منہ بنایا۔

"میرا مطلب ہے کہ آپ کو کس مرض کی دوا درکار ہے؟" عیدا جلدی سے بولا۔

چچا حیرت نے داڑھی کھجائی اور موسل ہاتھ میں پکڑے ہوئے کرسی پر آبیٹھے: "تشریف رکھیے جناب اور اپنی بیماری بتائیے"۔

وہ آدمی کرسی پر بیٹھ گیا اور بولا "رات اڑھائی بجے مجھے دو الٹیاں آئی ہیں"۔

"حالانکہ اڑھائی بجے اڑھائی الٹیاں آنی چاہئے تھیں!"۔ شیدے نے لقمہ دیا۔

چچا نے اسے گھورا اور مریض سے بولے "اچھا اچھا، فکر نہ کریں، ہم آپ کا مسئلہ حل کرتے ہیں"۔ چچا نے ایک کاغذ قلم پکڑا اور بولے "آپ کو الٹیاں کیوں آئیں کیا آپ نے زیادہ کھا لیا تھا؟"

"نہیں! میں نے تو بہت کم کھایا تھا"۔ اس نے کہا۔

"تو کیا آپ الٹے لٹک گئے تھے جو الٹیاں آ گئیں"۔ عیدے نے احمقانہ انداز میں کہا۔

"خاموش عیدے! مریض سے مذاق مت کرو، میں ان کی

الٹیاں سیدھی کرنے کی کوشش کر رہا ہوں اور تم درمیان میں ٹانگ اڑا رہے ہو"۔ چچا نے آنکھیں نکالیں۔

"ارے نہیں' حیرت یار' میری ٹانگ تو بہت دور ہے"۔ وہ ہنسا۔

"آپ اپنی نبض دکھایئے"۔ چچا نے نبض پکڑی اور ایک تیز چیخ ماری۔

"کیا ہوا..... کیا ہوا؟" وہ آدمی گھبرا گیا۔

"آپ کی زندگی کو سخت خطرہ ہے۔ آپ کے جسم میں ایک خطرناک زہر چلا گیا ہے۔ جس کا کچھ حصہ الٹیوں کے ذریعے نکل آیا ہے لیکن ابھی بہت سا زہر آپ کے جسم میں موجود ہے"۔ چچا نے حکیمانہ انداز میں تقریر کی۔

"نہیں نہیں..... یہ کیسے ہو سکتا ہے' میں نے تو کوئی زہریلی چیز نہیں کھائی"۔

"یاد کریں شاید آپ نے رات کو دودھ پیا ہو اور اس میں کوئی چھپکلی گر گئی ہو"۔ عیدا بولا۔

"یا پھر آپ نے ڈرم والے سے دودھ لیا ہو اور اس میں کوئی سانپ یا مینڈک ہو کیونکہ ڈرم والے دودھ میں چھپڑوں سے پانی ملاتے ہیں"۔ شیدے نے سر ہلایا۔

"اوہ....." مریض نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔ چپ کر جائیں آپ لوگ' آپ کی باتوں سے ہی مجھے ابکائیاں آنے لگی ہیں۔ آپ اچھا کریں گے میرا علاج' میں چلتا ہوں"۔

"نہیں نہیں ہم آپ کو ٹھیک کیے بغیر نہیں بھیجیں گے"۔ چچا بولے۔

"کیونکہ ہم نے تو بڑے بڑوں کو ٹھیک کر دیا ہے"۔ شیدا خواہ مخواہ ہنسا۔

"عیدے یار' وہ الماری سے سفید شیشی لاؤ"۔ چچا نے اشارہ کیا۔ عیدے نے شیشی چچا کو پکڑائی' چچا نے مریض سے کہا "لیجئے جناب! یہ سفوف ہے' ایک چمچ پانی میں ڈال کر ابالیے اور قہوے کی طرح بار بار پیجئے۔ آپ کی طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔ صرف پچاس روپے دے دیجئے"۔

"اچھا چلو' دیکھتے ہیں"۔ وہ شخص رقم دے کر چلا گیا۔

"ہر..... دیکھا' ہیلپ لائن سے تو یہ کام بہتر ہے۔ کچھ آمدنی تو ہو گی' حیرت ہے"۔ چچا حیرت نے کہا۔

"لیکن حیرت یار' اگر کسی مریض کو نقصان پہنچ گیا تو کیا ہو گا؟ تمہارے پاس تو حکمت کا سرٹیفکیٹ بھی نہیں ہے"۔ عیدے نے کہا۔

"نیم حکیم' خطرۂ جان" شیدے نے فقرہ کسا۔

"ارے نقصان کسی کو پہنچ ہی نہیں سکتا۔ ہماری قسمت اچھی تھی کہ ہمیں یہ کتاب مل گئی۔ اب ہم کچھ ہی دنوں میں اپنا سکہ جما لیں گے"۔ چچا حیرت نے ایک کتاب میز کی دراز سے

نکال کر لہرائی جس پر لکھا تھا:

"گھر بیٹھے حکیم بنئے!"۔

"ابے عیدے اور شیدے' یہ تمہارے موٹے موٹے پیٹ اور سڈول بازو کب کام آئیں گے۔ تم دونوں بیٹھ کر یہ دوا کوٹو"۔ چچا نے موسل چٹائی پر پھینکتے ہوئے کہا۔

"آئے ہائے..... مر گیا..... میں مر گیا"۔ دروازے سے ایک آواز گونجی۔

"مر گیا تو بول کیسے رہا ہے..... جا کے قبرستان میں آرام کر"۔ عیدے نے منہ بنایا۔

"عیدے..... عیدے..... یہ مریض لگتا ہے"۔ شیدا بولا۔

"آیئے آیئے جناب' تشریف سمیت آیئے"۔ چچا حیرت خوشی سے بولے۔

"ہائے....." وہ آدمی کرسی پر بیٹھا اور کہنے لگا "میں..... میں جا تو ڈاکٹر کے پاس رہا تھا لیکن آپ کا بورڈ دیکھا تو سوچا کہ آپ سے ہی دوا لے لوں"۔

"بالکل' آپ ٹھیک جگہ پر آگئے ہیں جناب' ہماری دواؤں کے سائیڈ ایفیکٹ بھی نہیں ہوتے۔ فرمایئے کیا مسئلہ ہے؟" چچا حیرت نے کہا۔

"آپ نے..... آپ نے صدر بازار دیکھا ہے نا؟" وہ بولا۔

"ہاں ہاں" چچا حیرت' حیرت سے بولے۔

"صدر بازار کے تیسرے چوک میں ایک کھمبا آتا ہے۔ اس کھمبے کے ساتھ ایک پان سگریٹ کا کھوکھا ہے۔ کھوکھے کے ساتھ ایک فروٹ والے کی دکان بھی ہے"۔ اس نے کہا۔

"اچھا اچھا' آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟"

"بتا تو رہا ہوں' صبر تو کیجئے۔ اس فروٹ والے کی دکان کے ساتھ ایک گوشت والے کی دکان ہے۔ اس دکان کے ساتھ ایک تنگ سی گلی اندر مڑتی ہے۔ میں اس گلی کے پاس سے گزر رہا تھا کہ اچانک مجھے یوں محسوس ہوا کہ کسی نے میرا دل مٹھی میں پکڑ لیا ہے"۔

"اوہ..... ہوا"۔ چچا زور سے اچھلے۔

عیدا اور شیدا اس شخص پر جھک گئے اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس کے دل کی طرف دیکھنے لگے۔

عیدے نے کہا "سینے میں کوئی سوراخ نہیں ہے۔ مٹھی میں دل نہیں پکڑا جا سکتا"۔

"خاموشی" وہ شخص دھاڑا "آپ مذاق اڑا رہے ہیں میرا! ہائے..... مجھے یوں لگ رہا ہے کہ مجھے ہارٹ پرابلم ہو گیا ہے۔ میرے دل میں اب بھی ہلکا ہلکا درد ہو رہا ہے"۔

شیدے نے فوراً شعر پڑھا:

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کروبیاں

چچا حیرت نے اس پر توجہ نہ دیتے ہوئے کہا "عیدے! لے یہ شیشی' اس میں معجون مفرح قلب ڈال دے"۔

عیدے نے معجون شیشی میں ڈال کر مریض کے سامنے رکھا اور بولا "اب اس کے استعمال کی ترکیب بھی اچھی طرح سمجھ لو۔ کرنا یوں ہے کہ یہاں سے باہر نکل کر بائیں ہاتھ مڑنا ہے' کچہری روڈ آئے گا۔ وہاں ایک رکشہ سٹینڈ ہے۔ لیٹر بکس کے ساتھ ایک موچی بیٹھا ہے۔ اس موچی کے پاس کھڑے ہو کر معجون چاٹ لینا' دل کو تقویت ملے گی"۔

"اور سو روپے کا نوٹ مجھے دے دیں' اپنے خون پسینے سے بنایا ہے ہم نے یہ معجون" چچا نے کہا۔

"کیا کہا' خون اور پسینے سے؟ تھو تھو تھو..... میں نہیں لیتا یہ گندا معجون"۔ اس نے برا سا منہ بنایا۔

"ارے بھئی' یہ محاورہ ہے محاورہ یعنی ہم نے سخت محنت سے یہ تیار کیا ہے۔ آپ اسے کھائیں گے تو مزا آجائے گا' حیرت ہے"۔ چچا نے آنکھیں گھمائیں۔

"اچھا' چلو' لے لیتے ہیں"۔ اس نے سو کا نوٹ چچا حیرت کو دیا اور چلا گیا۔

چچا حیرت اور عیدے' شیدے کی باچھیں کھل رہی تھیں۔ کام پہلے دن ہی خوب چل نکلا تھا۔ شام تک انہوں نے دو اور مریض دیکھے اور انہیں ہاضمے کی دوائیں دیں۔

اگلے دن وہ صبح صبح اپنی دکان میں جو پہلے ہیلپ لائن کا دفتر تھا' آکر بیٹھے ہی تھے کہ تین چار بڑی بڑی مونچھوں والے

آدمی اندر آگھسے اور بڑی بدتمیزی سے بولے: "تم میں سے حکیم کون ہے؟"

عیدے نے تھر تھر کانپتے ہوئے کہا "وہ دراصل چھوٹا پیشاب کرنے گئے ہوئے ہیں"۔

شیدے نے فوراً کہا "حالانکہ اتنے بڑے ہو گئے ہیں ابھی تک چھوٹا پیشاب کرتے ہیں"۔

"آپ بتایئے معاملہ کیا ہے' حیرت ہے"۔ چچا حیرت نے گھبراتے ہوئے پوچھا۔

"یہ ہم اسے ہی بتائیں گے۔ بنا پھرتا ہے حکیم!" ایک آدمی گرجا اور وہ سب کرسیاں کھینچ کر ان پر بیٹھ گئے اور انتظار کرنے لگے۔

عیدا' شیدا اور چچا حیرت ایک کونے میں کھڑے رہے۔ پھر ایک آدمی نے کہا ابھی تک نہیں آیا حکیم' کہاں پیشاب کرنے گیا ہے وہ اور تم تینوں کون ہو؟"

عیدے نے فوراً ہونقوں کی طرح کہا "اصل میں حکیم صاحب نے کئی دنوں سے پیشاب روک رکھا تھا' اس لیے آج انہیں کرنے میں اتنی دیر ہو گئی' ہم تو خود مریض ہیں اور ان کا انتظار کر رہے ہیں"۔

اچانک چچا حیرت کو جوش آگیا' انہوں نے داڑھی پر ہاتھ پھیرا اور بولے "میں ہوں حکیم' بتاؤ تم کیوں اتنی بدتمیزی سے پیش آرہے ہو؟"

"ہوں..... بدتمیزی! تم ہمارے ساتھ چلو تمہاری دوائی سے ہمارا مریض موت کے منہ میں چلا گیا ہے'۔ ایک پتلا آدمی چلا کر بولا۔

عیدا اور شیدا ایک دم بولے "انا للہ وانا الیہ راجعون" اللہ مرحوم کو جنت میں پندرہ مرلے کی کوٹھی عطا فرمائے اور اس کے بچوں کو صبر"۔

"خاموش!" دو تین آدمی گرجے" ہمارے بھائی ابھی زندہ ہیں' وہ بے ہوش پڑے ہوئے ہیں اور ہسپتال میں داخل ہیں"۔

"لیکن میری دواؤں سے کسی کو نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ یہ دیکھو یہ سب نسخے اس کتاب میں لکھے ہیں اور یہ کتاب دس روپے کی ہر فٹ پاتھ پر سے مل جاتی ہے۔ چاہے قسم لے لو اور یہ کتاب ایک بہت بڑے حکیم اور سنیاسی نے لکھی ہے"۔ چچا الابلا بولنے لگے۔

"تم ہمارے ساتھ چلو ہم تمہیں مریض کی حالت دکھانا چاہتے ہیں۔ پھر تمہارے ساتھ کیا سلوک ہو گا یہ بعد کی بات ہے"۔ ایک موٹے آدمی نے مونچھوں کو تاؤ دیا۔

عیدے اور شیدے نے اپنے بازو چڑھا لیے اور گرج کر بولے "خبردار' اب تم نے اگر ہمارے حیرت یار کے ساتھ کوئی بدتمیزی کی تو تمہارے دانت نکال کر رکھ دیں گے"۔

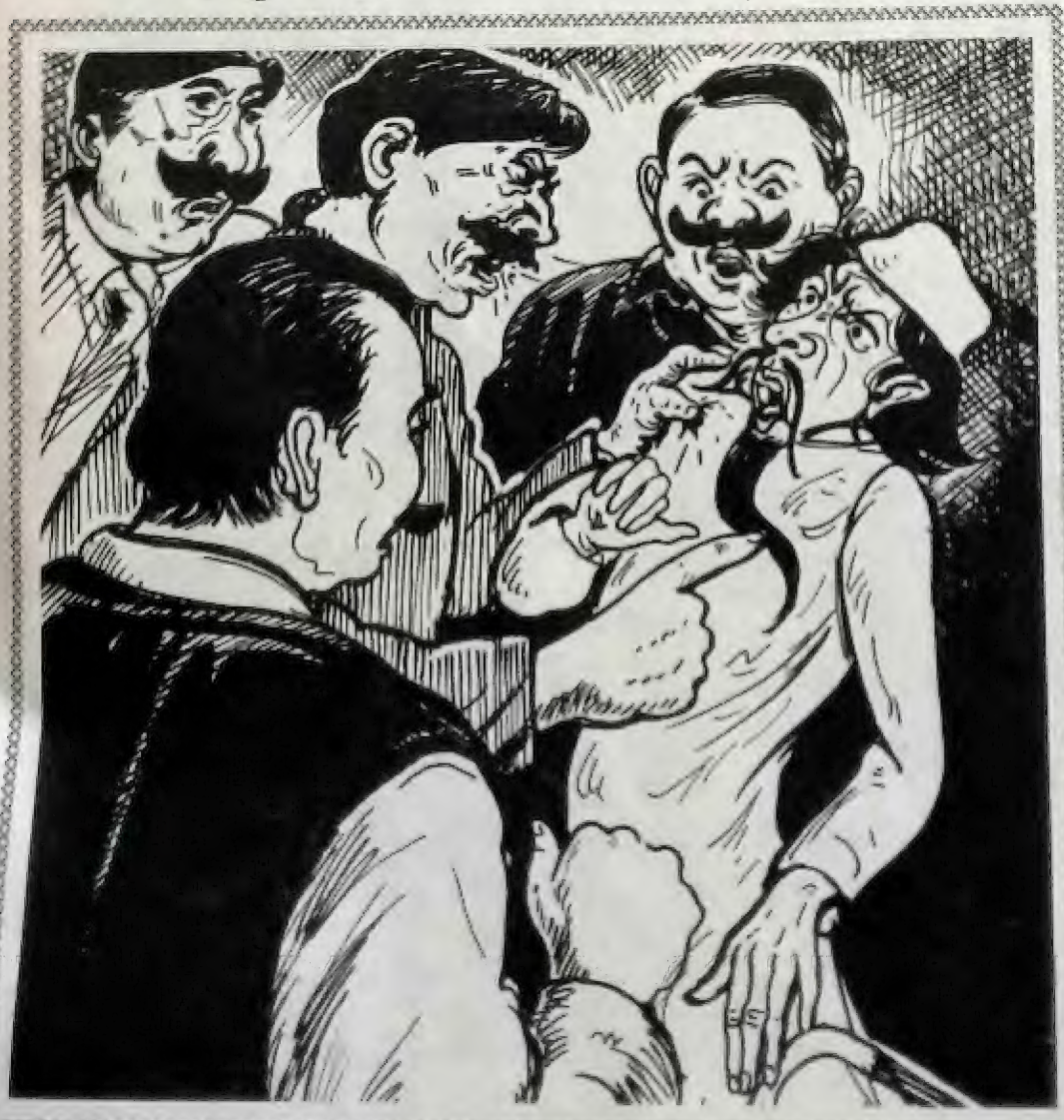

"اچھا..... تو تم دونوں اس حکیم کے باڈی گارڈ ہو' چلو تم بھی ہمارے ساتھ چلو۔ تم دونوں ہمیں اس جعلی حکیم کے ساتھ برابر کے شریک نظر آتے ہو"۔

وہ سب دو رکشوں میں بیٹھ کر ایک ہسپتال میں آپہنچے۔ چچا حیرت دل ہی دل میں "جل تو جلال تو' آئی بلا کو ٹال تو' پڑھ رہے تھے۔ پھر انہوں نے دیکھا کہ ایک بیڈ پر وہی آدمی آنکھیں بند کیے پڑا تھا جو دل کے درد کا معجون لے کر گیا تھا۔ اس کے ایک بازو میں ڈرپ لگی ہوئی تھی۔

"یہ دیکھو! یہ ہمارے بھائی جان ہیں' انہوں نے کل بتایا تھا کہ یہ کچہری روڈ کی تیسری گلی میں ایک نئے حکیم سے دوا لائے ہیں۔ اب یہ مسلسل بے ہوش ہیں اور ڈاکٹر انہیں ہوش میں لانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اگر انہیں کچھ ہو گیا تو تمہارے خلاف قتل کا پرچہ ہو جائے گا"۔

چچا حیرت اور عیدا' شیدا بیڈ کے قریب سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ عیدے نے کہا "یار شیدے کوئی دعا پڑھو' جس سے یہ مریض جلد آنکھیں کھول دے"۔

شیدے نے دونوں ہاتھ دعا کے انداز میں اٹھائے اور زور سے بولا: "کل نفس ذائقته الموت"

مریض کے بھائیوں کی مونچھیں غصے سے پھڑکنے لگیں۔

بیڈ کے سرہانے سائیڈ ٹیبل پر کچھ آم رکھے ہوئے تھے۔ ان کی خوشبو چچا حیرت کو بے چین کر رہی تھی۔ ان کا ہاتھ بے ساختہ آموں کی طرف بڑھتا اور پھر پیچھے ہٹ جاتا۔

اچانک مریض نے حرکت کی۔ اس کے بھائی اس پر جھک گئے اور بولے "بھائی جان..... بھائی جان"۔

"ہاں..... ہاں" اسے ہوش آگیا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور بولا "میں یہاں کیوں لیٹا ہوا ہوں؟"۔

"آپ بے ہوش ہو گئے تھے' آپ ہسپتال میں ہیں اور یہ رہے آپ کے مجرم! ان کی دوائی کھانے سے آپ کی حالت خراب ہوئی تھی نا؟" مریض کے موٹے بھائی نے کہا۔

مریض چند لمحے خاموش پڑا آنکھیں جھپکتا رہا۔ پھر اس نے گردن ہلائی اور چچا حیرت کی طرف دیکھ کر بولا:

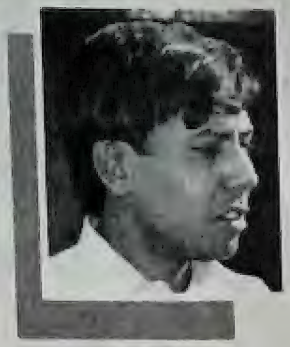

محمد ادریس قریشی

"چچا حیرت" کے قہقہہ بار اور ہنستے مسکراتے کردار کے خالق' معروف ادیب و شاعر محمد ادریس قریشی کا قلم ہر لمحہ ہر آن "تعلیم و تربیت" کے ذریعے ننھے منے بچوں کے چہروں پر خوشیوں' قہقہوں اور مسکراہٹوں کے رنگ بکھیرتا نظر آتا ہے..... اور یہ کام قابلِ قدر ہی نہیں' لائق تحسین بھی ہے!

"کاش..... میں ان کی دوا کھا لیتا"۔

"کیا کہا؟ آپ نے ان کی دوا نہیں کھائی تھی؟" اس کے بھائی بولے۔

"نہیں! ان کا دیا ہوا معجون تو یوں ہی پڑا ہے سارا۔ میں نے سوچا کہ یہ معجون بھلا کیا فائدہ دے گا۔ میں نے راستے میں ایک ڈاکٹر سے دوا لے لی۔ وہ چھوٹی چھوٹی سولہ گولیاں تھیں۔ ایک گولی ہر روز رات کو کھانا تھی۔ میں نے سوچا کہ یہ چھوٹی سی گولی کیا فائدہ دے گی۔ اس لیے میں نے چار پانچ گولیاں اکٹھی کھا لیں۔ پھر مجھے نہیں پتا کیا ہوا"۔

"اوہ..... ہم معافی چاہتے ہیں جناب کہ آپ سے گستاخی سے پیش آئے"۔ ایک آدمی نے چچا حیرت سے کہا۔

"آپ..... آپ یہ آم لیجیے نا" دوسرے آدمی نے کہا۔

چچا حیرت اور عیدے شیدے نے فوراً ایک ایک آم جھپٹ لیا اور اس پرندیدوں کی طرح دانت گاڑ دیئے۔ ☆☆☆

خوش قسمتی ہر آدمی کا دروازہ کھٹکھٹا کر پوچھتی ہے:
کیا سمجھ داری گھر کے اندر موجود ہے؟
پھول اپنی خاموش زبان میں یہ اعلان کر رہے ہیں کہ: "انسانوں کے درمیان پھول بن کر رہو!"

سوالوں کے صحیح جواب دیجئے اور 450 روپے کی کتابیں لیجئے:

ایک سے زائد اور سات سے کم حل موصول ہونے کی صورت میں انعام مساوی مالیت میں دیئے جائیں گے۔ سات یا سات سے زیادہ حل موصول ہونے کی صورت میں فیصلہ بذریعہ قرعہ اندازی ہوگا اور چھ انعام بالترتیب 100, 90, 80, 70, 60 اور 50 روپے کی مالیت کی کتابوں کے دیئے جائیں گے۔

1- پیارے نبی ﷺ کے زمانے میں پہلی ہجرت کہاں کی گئی؟
2- غزوہ احد میں آنحضور ﷺ کے کون سے چچا شہید ہوئے تھے؟
3- مشہور صوفی بزرگ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ ایران کے کس شہر میں پیدا ہوئے تھے؟
4- "بانگِ درا" کس شاعر کا مجموعہ کلام ہے؟
5- جملہ مکمل کیجئے: شہنشاہ..... مغلیہ سلطنت کا بانی تھا۔
6- ان دو شہروں کے نام بتایئے جہاں دوسری جنگ عظیم میں امریکا کی طرف سے ایٹم بم گرائے گئے تھے؟
7- شعر کا پہلا مصرع بتایئے: زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری
8- بتایئے "مصورِ مشرق" کس پاکستانی شخصیت کو کہا جاتا ہے؟
9- اقوام متحدہ کا صدر دفتر کہاں واقع ہے؟
10- فلپائن کے دارالحکومت کا نام بتایئے؟

جوابات علمی آزمائش مئی 2005ء

1- بخاری شریف۔ 2- حضرت حسان بن ثابتؓ۔ 3- معراج کے موقعہ پر۔ 4- صحیح۔ 5- انڈے۔ 6- لاہور میں۔ 7- نظر آتی ہے ان کو اپنی منزل آسمانوں میں۔ 8- اس لیے کہ یہ گیس سوئی کے مقام پر دریافت ہوئی تھی۔ 9- دال۔
10- طرابلس (تریپولی)۔

اس ماہ بے شمار ساتھیوں کے بالکل درست حل موصول ہوئے۔ ان میں سے ان 6 ساتھیوں کو بذریعہ قرعہ اندازی انعام دیئے جارہے ہیں۔

☆ پہلا انعام: عطیہ فاطمہ' اسلام آباد۔
☆ دوسرا انعام: سمیعہ خالد' جھنگ صدر۔
☆ تیسرا انعام: ارسلان شبیر' لاہور۔
☆ چوتھا انعام: لبنیٰ یوسف' حسن ابدال۔
☆ پانچواں انعام: جنید لطیف' پشاور۔
☆ چھٹا انعام: پاکیزہ' حیدر آباد۔

ان ساتھیوں کے نام بذریعہ قرعہ اندازی شائع کئے جارہے ہیں:۔
خدیجہ حفیظ ملتان۔ محمد نعمان واہ کینٹ۔ شاہ زیب خان کوہاٹ۔ محمد انور صدیقی کراچی۔ نبیلہ احمد حیدر آباد۔ طوبیٰ فیصل رحیم یار خان۔ حفظہ فاطمہ گجرات۔ جاوید حسن کوئٹہ۔ طیبہ ادریس کراچی۔ احمد رضا چشتیاں۔ حسن علی شہداد پور۔ محمد قائم خان درگئی۔ شمیلہ شاہد کراچی۔ عائشہ پروین کراچی۔ اسماء ظفر موسیٰ والی۔ محمد ماجد ڈیرہ اسماعیل خان۔ نعمان ظہور جوہر آباد۔ فہد احمد کراچی۔ مظہر لون مظفر آباد۔ حنیا کنول رحیم یار خان۔ ظل ہما سیالکوٹ۔ نیرہ گلشن سرگودھا۔ عزیز ناصر چکوال۔ عاصمہ مومن بہاولپور۔ محمد اسد اسلام آباد۔ انس عدنان سکھر۔ حرا خالد ٹیکسلا کینٹ۔ حفصہ طیبہ اسلام آباد۔ عبدالکریم گوجرہ۔ ابو ذر غفاری کوہاٹ۔ سلمان فاروق رحیم یار خان۔ محمد مصدق حسین فتح جنگ۔ عالیہ اشرف لاہور۔ نایاب علی خانیوال۔ احتشام الحق حیدر آباد۔ محمد کاشف نیر واہ کینٹ۔ حفیظ الرحمان پپلاں۔ محمد تنویر یونس بھکر۔ ابصار احمد ملکوال۔ احتشام الحسن جہلم۔ عدن طارق لاہور۔ احسن علی کراچی۔ شمسہ یوسف ایبٹ آباد۔ محمد اعجاز لاہور۔ عمیر اشرف لاہور۔ جسمین احمد ہنگو۔ عابد یٰسین لیہ۔ نورین طارق بنوں۔ محمد عدنان میانوالی۔ محمد رضوان کراچی۔

ہر حل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10 جون 2005ء

دماغ لڑاؤ

نام: _____

مقام: _____

پتا: _____

_____

ممتاز ادیبہ و شاعرہ نسرین سحرش خلیلی لاہور سے ایم ایس سی ہوم اکنامکس شعبہ چائلڈ گائیڈنس میں امتیاز پاچکی ہیں۔ شاید اسی لیے ان کی کہانیاں بچوں کی تربیت اور کردار سازی کے حوالے سے قابل قدر مانی جاتی ہیں۔

تلاش

نسرین سحرش

بھولی بھالی صورت، تیکھے نقوش اور سنہری گلابی رنگت رکھنے والا بلال جو سرخ حویلی کے مکینوں میں "بلے" کے نام سے پکارا جاتا تھا بہت ہی پیاری اور سادہ طبیعت کا مالک تھا۔ کڑوی کسیلی باتوں کو خندہ پیشانی سے قبول کرنا، سب کی خدمت کے لیے ہر وقت تیار رہنا اس کی طبیعت کا خاصا تھا۔

وہ کون تھا......؟ کہاں سے آیا اور کب آیا......؟ اسے کچھ یاد نہیں البتہ حویلی کے مکین اس کے بارے میں صرف اتنا جانتے تھے کہ محلے کے مولوی صاحب اسے ان کی تحویل میں دینے آئے تو مالکن اس خوبصورت بچے کو دیکھ کر حیران رہ گئیں۔ "مولوی صاحب یہ بچہ کون ہے......؟ ادھر آؤ بیٹا، یہاں آؤ......" اور مالکن نے بلال کو یوں بازوؤں میں بھر لیا کہ ایک لمحہ تو بلال کو لگا کہ جیسے وہ جلتی دھوپ سے اچانک کسی سائبان تلے آگیا ہو۔ ممتا کی گود کی گرمی سے تو وہ یکسر ناواقف تھا، پھر بھی اس کا دل چاہا کہ یہ لمحے یونہی امر ہو جائیں اور وہ اسی طرح مالکن کے سینے سے لگ کر کھڑا رہے مگر...... جلد ہی مالکن کو اپنے وقار اور بلال کے کمتر ہونے کا احساس ہو گیا۔ مالکن کی نظریں پھر بلال کے معصوم چہرے سے الجھ گئیں۔ مولوی صاحب نے نہایت شفیق انداز میں بتایا "یہ بچہ صبح مسجد میں سویا ہوا ملا ہے، پوچھنے پر صرف یہی بتایا ہے کہ یتیم ہے اور کوئی کام کرنا چاہتا ہے"۔ مولوی صاحب چند لمحوں کے لیے رک کر پھر گویا ہوئے "سو بی بی صاحبہ! آپ صاحبِ ثروت ہیں۔ اس کے سر پر دستِ شفقت رکھ دیں خدا آپ کو اس کا اجر دے گا" اور یوں حویلی کی مالکن نے بلال کے پیٹ کا خالی دوزخ بھرنے کے ساتھ ساتھ اس کی قسمت کا خالی کشکول بھرنے کی بھی حامی بھر لی۔

شروع شروع میں مالکن کا رویہ بلال کے ساتھ بے حد نرم رہا۔ وہ اس کا بے حد خیال رکھتیں مگر آہستہ آہستہ مالکن کے رویے میں سختی آتی چلی گئی اور یوں بلال رفتہ رفتہ گھر کے ہر مکین کی ضرورت بن گیا۔ گھر کے بہت سے کام بلال کے بغیر ادھورے خیال کیے جانے لگے۔ اب بلال کو یوں لگا جیسے ایک بار پھر اسے تپتے صحرا میں چھوڑ دیا گیا ہو۔ آہستہ آہستہ اس کی حیثیت ایک غلام کی سی ہو کر رہ گئی۔ صبح سویرے ہر طرف سے صدائیں بلند ہونا شروع ہو جاتیں "بلے! میرے کپڑے استری کر دو"۔ "بلے! ذرا ادھر تو آنا۔ دیکھو، شوز پالش کرتے

ہوئے انہیں اس قدر چکایا کرو کہ اپنی شکل ان میں دیکھ سکو" اور بلا..... کچھ نہ سمجھتے ہوئے اور بہت کچھ سمجھتے ہوئے "جی اچھا" کہہ کر جوتے اٹھانے ہی لگتا کہ مالکن پکارتیں "بلے او بلے..... ذرا بچوں کے بیگ اٹھاؤ..... انہیں گاڑی میں رکھو اور بچوں کی گاڑی میں بیٹھنے میں ان کی مدد کرو"۔ وہ سب کی باتیں برداشت کر لیتا مگر نجانے کیوں..... مالکن کی سختی اس کی آنکھوں کو کیوں نم کر دیتی..... نجانے کیوں..... شاید اس لیے کہ مالکن کی صورت میں اسے ایک بار ماں کی ممتا نظر آئی تھی۔ بلال ایک خادم کی صورت "جی اچھا' ابھی آیا' جی ابھی حاضر ہوا" کہتا ہوا گھر بھر میں بھاگتا پھرتا۔

وقت گزرتا رہا۔ ماہ و سال بدلے تو دیواروں پر لگے کیلنڈر بھی بدلے' رت بدلی' موسم بدلے مگر..... بلال کے شب و روز کسی غریب کے مقدر کی طرح ایک جگہ ساکن تھے۔ خدمت' خدمت اور بس خدمت..... یہ تھے بلال کے شب و روز۔

دن بھر کی مشقت کے بعد رات گئے جب بلال بستر پر آتا تو وہ بستر اسے مالکن کی آغوش کی مانند لگتا۔ ایک مہرباں آغوش جس میں چند لمحوں کے لیے اس نے زندگی کا لطف حاصل کیا تھا۔ محبت کی چاشنی محسوس کی تھی۔ بستر پر آتے ہی وہ دن بھر کی تلخی لمحوں میں بھول کر نیند کی وادی میں اتر جاتا۔ صبح سویرے چڑیوں کی سریلی چہکار سے اگر اس کی آنکھ نہ بھی کھلتی تو مالکن کی گرجدار آواز اسے لمحوں میں خوابوں کی دنیا سے نکال لاتی اور بلال..... آنکھیں ملتا ہوا' کسی روبوٹ کے مانند اگلے لمحوں ہاتھ باندھے مالکن کے حضور کھڑا ہوتا۔

جیسے جیسے بلال شعور کی منزلیں طے کر رہا تھا اردگرد کے ماحول سے آگہی کی خواہش اس کی سوچ کا حصہ بنتی جا رہی تھی۔ حویلی کے مکینوں میں دینداری تو بس نام کو تھی مگر دنیا داری کو وہ خوب نبھا رہے تھے۔ بلال شاید بہت ہی نیکوکاروں کی اولاد تھا کیونکہ اس طرح کے آزاد ماحول میں وہ خود کو اَن فٹ محسوس کرتا تھا۔ وہ اکثر سوچتا کہ کیا وہ اس دنیا میں صرف اس لیے آیا ہے کہ استادوں کی خدمت کرے' حویلی کے مکینوں کا غلام بن کر زندگی گزار دے۔ جیسے ہی یہ سوچ بلال کے دماغ میں سر اٹھاتی کوئی دبی دبی چیخ میں اسے اندر سے پکار اٹھتا..... "نہیں..... نہیں بلال! تمہاری زندگی کا مقصد حویلی کے مکینوں کی خدمت ہی نہیں..... کچھ اور بھی ہے۔ اپنے آپ کو پہچانو' اسے پہچانو جو تمہارا اور ان سب کا بھی خالق ہے جنہوں نے تمہیں صرف اور صرف اپنا غلام بنا کر تمہاری عزتِ نفس کو تین وقت کی روٹی کے عوض خرید لیا ہے"۔ مگر کس طرح.....؟ بلال اپنے آپ سے اُلجھ کر سوال کرتا..... وہ سوچتا' کون ہے جو مجھے یہ بات سمجھنے میں میری مدد کرے..... کس کے پاس جائے.....؟ اور ایک دن..... ہاں ایک دن..... بلال کی زندگی میں ایسا بھی آیا جس میں اس کے تمام سوالوں کے جواب بھی موجود تھے اور نور ہدایت کی وہ روشنی بھی جس نے اس کی آنکھوں سے غفلت اور لاعلمی کے سب پردے ہٹا کر اسے سیدھی راہ پر ڈال دیا۔

ہوا یوں..... کہ ایک دن..... یہ جمعۃ المبارک کا دن تھا۔ ٹی وی پر حج کے روح پرور مناظر براہ راست دکھائے جا رہے تھے۔ ہر طرف انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر اور سب کے لبوں پر ایک ہی صدا تھی: "لبیک اللھم لبیک" کبھی کبھار ان الفاظ کا اردو ترجمہ بھی ٹی وی اسکرین پر دکھایا اور زبان سے دہرایا جاتا تھا: "حاضر ہوں اے اللہ! میں حاضر ہوں"۔ بچپن سے اب تک یہ الفاظ کئی بار بلال کی سماعت سے ٹکرائے مگر آج جب وہ عمر کے اس حصے میں تھا جہاں انسان شعور اور ضمیر کی آواز سن سکتا ہے اسے ان صداؤں میں انوکھا سرور محسوس ہو رہا تھا۔ آج بلال کے قدم بار بار ان صداؤں پر ٹی وی لاؤنج کی طرف بڑھ جاتے اس کا دل چاہتا وہ سب کام چھوڑ کر یہ مناظر دیکھتا رہے مگر..... مالکن کی آواز پر وہ چونک اٹھا "بلے..... او بلے..... ادھر آؤ آج کچھ کام بھی کرو گے یا یونہی ٹی وی دیکھتے جاؤ گے۔ جاؤ جا کر بازار سے سودا لے کر آؤ!"۔ اور بلال "جی اچھا مالکن ابھی آیا..... ابھی حاضر ہوا" کہہ کر بے دلی سے سودا لینے بازار کی جانب چل دیا۔ یہ نماز جمعہ کا وقت تھا۔ آج پہلی بار..... ہاں شاید پہلی بار اس نے موذن کی صدا پر غور کیا۔ انجانے میں اس کے قدم خود بخود قریبی مسجد کی جانب بڑھنے لگے۔ چند لمحوں کے لیے وہ بھول گیا کہ وہ گھر سے کس کام کے لیے نکلا ہے۔ اس نے غور کیا کہ موذن کی صدا پر لوگ کس طرح گھر سے نکل پڑے ہیں۔ صاف ستھرے' اجلے لباس میں باوضو لوگ بلال کو بے حد بھلے لگے۔

ایک لمحے کو رک کر اس نے اپنے میلے کچیلے لباس پر نظر دوڑائی تو اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے مگر وہاں کوئی نہ جان سکا کہ یہ آنسو ندامت کے تھے یا بے بسی کے..... شاید بلال بھی۔ اس نے دیکھا کہ صحن میں کچھ لوگ وضو کر رہے ہیں۔ وہ سبزی کے لیے لانے والے

تھیلے کو ایک طرف رکھ کر بے اختیار آگے بڑھا اور وضو کرنے والوں کی قطار میں شامل ہو گیا۔ یہاں ایک بار اسے پھر شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا کہ وہ تو وضو کے طریقے سے ہی ناواقف تھا۔ ایک اچٹتی سی نظر ڈال کر وہ دائیں بائیں وضو کرنے والوں کو دیکھ لیتا اور وہی طریقہ دہراتا۔ اس نے محسوس کیا کہ ایسا کرنے سے اسے بے حد سکون مل رہا ہے۔ کچھ ہی دیر بعد وہ نمازیوں کی صف میں کھڑا تھا..... مگر بے حد افسردہ..... ندامت کے ساتھ کہ اسے تو نماز کا طریقہ بھی معلوم نہیں تھا۔ وہ خاموش کھڑا رہا نماز کے تمام فرائض اس کے آنسو ادا کرتے رہے۔ نماز ختم ہوئی تو بلال نے محسوس کیا کہ اس کی بے قرار روح کو قرار آچکا ہے۔ وہ جب گھر سے نکلا تو کس قدر پریشان اور بے چین تھا مگر ان چند لمحوں نے اس کے مردہ دل میں زندگی سے بھرپور احساس بھر دیا تھا۔ وہ ایک عجیب سرشاری کی کیفیت سے دو چار تھا۔

نمازی گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ بلال بھی سودا لے کر دوڑتا ہوا گھر واپس لوٹا۔ آج مالکن کی ڈانٹ نے بلال کو کچھ زیادہ پریشان کیا۔ وہ ڈانٹ سن کر خاموشی سے اپنے کاموں میں مشغول ہو گیا۔

عین عصر کے وقت موذن کی وہی صدا..... دلوں کو چھو لینے والی صدا..... ویران دلوں کو رحمتوں سے بھر دینے والی صدا پھر قریبی مسجد سے بلند ہوئی تو بلال خود پر قابو نہ رکھ سکا۔ اس کے قدم ایک بار پھر اسی راستے پر جانے کے لیے بے چین ہو گئے۔ وہ مالکن کو "ابھی آیا" کہہ کر مسجد کی جانب دوڑا۔ مالکن بھی اس تبدیلی پر بے حد حیران تھیں۔ نماز عصر ادا کرنے کے بعد وہ سیدھا مولوی صاحب کے پاس گیا۔ مولوی صاحب نے پہلی نظر میں ہی اسے پہچان لیا اور سینے سے لگا کر کہنے لگے "بلال معاف کرنا' میں تو تمہیں حویلی والوں کی تحویل میں دے کر تم سے اتنا غافل ہوا کہ کبھی مڑ کر نہ پوچھا کہ تم کس حال میں ہو؟ کہو کیسی گزر رہی ہے؟"۔ بلال نے دکھ بھرے لہجے میں کہا "مولوی صاحب! آپ نے مجھے جن لوگوں کے حوالے کیا' مجھے ان سے کوئی شکایت نہیں جو میرے مقدر میں لکھا جا چکا ہے' مجھے مل رہا ہے۔ دن بھر کی مشقت کے عوض تین وقت کا کھانا تو مجھے مل ہی جاتا ہے مگر..... مگر میری روح کو جس غذا کی ضرورت ہے وہ غذا ان کے پاس نہیں..... مولوی صاحب! وہ غذا مجھے آپ سے مل سکتی ہے۔ مجھے بتائیں میں کون ہوں میری زندگی کا مقصد کیا ہے.....؟ آخر اذان میں ایسی کون سی کشش ہے کہ لوگ اپنے مسائل' کاروبار اور دیگر مصروفیات کو چھوڑ کر مسجد کی طرف دوڑ پڑتے ہیں"۔ مولوی صاحب کو بلال کی معصومیت پر بے حد پیار آیا اور حویلی کے مکینوں پر قدرے غصہ بھی۔ وہ سوچنے لگے' کیا حویلی کی مالکن بلال کو ابھی تک ان بنیادی عقائد کے بارے میں بھی کچھ نہ بتا سکیں حالانکہ یہ تو ان کا اخلاقی فرض تھا۔ مولوی صاحب نے نہایت سادہ الفاظ میں بلال کو سمجھاتے ہوئے کہا "بیٹا اذان دراصل ایک یاددہانی ہے خدا کی

جس آدمی کے پاس کتاب ہے، وہ اکیلا نہیں ہے!

طرف سے اپنے بندوں کو۔ انسان خطا کا پتا ہے۔ دن بھر کے کاموں میں اس قدر مشغول ہو جاتا ہے کہ بھول جاتا ہے کہ اسے خدا کی دی گئی بے شمار نعمتوں پر سجدہ شکر بھی بجا لانا ہے۔ سو یہ ایک صدا ہے کہ "آؤ نماز کی طرف، آؤ فلاح کی طرف! اذان ہمیں احساس دلاتی ہے کہ خدا ایک ہے۔ وہ سب سے بڑا ہے مگر..... افسوس بلال بیٹے! ایسے لوگ اپنے رب کی اس صدا پر لبیک کہنے کے بجائے دنیاوی خداؤں کو خوش کرنے میں اس قدر مشغول ہوتے ہیں کہ اس فرض کی ادائیگی کو پس پشت ڈال دیتے ہیں"۔ مولوی صاحب کی باتیں بلال کے دل و دماغ کی بند گرہوں کو کھول رہی تھیں۔ اسے یوں لگا کہ جیسے وہ اندھیرے سے روشنی کی طرف سفر کر رہا ہے۔ مولوی صاحب بلال کے چہرے کو دیکھ کر اس کے اندر پھوٹنے والی روشنی کو محسوس کر رہے تھے۔ وہ پھر بلال سے مخاطب ہوتے ہوئے کہنے لگے "اور پھر تم خود ہی بتاؤ بلال بیٹے..... جب تمہاری مالکن تمہیں بلائے اور تم نہ جاؤ اور اگر جاؤ بھی تو نہایت بے دلی اور سستی کے ساتھ تو وہ تم پر کس قدر برہم ہوتی ہے مگر افسوس..... خدا کی طرف سے دن میں پانچ بار اذان بندے کو اپنے رب کی طرف رجوع کرنے کے لیے اسے پکارتی ہے مگر ہم خطاؤں کے پتلے اس صدا پر لبیک نہیں کہتے"۔ مولوی صاحب کے منہ سے لبیک کا لفظ سن کر بلال چونک گیا۔ "مولوی صاحب لبیک کا مطلب کیا ہے؟" مولوی صاحب فرمانے لگے "بیٹا اس کا مطلب ہے" میں حاضر ہوں! بلال نے ندامت سے سر جھکا لیا اور سوچنے لگا۔ کہ اس کا مطلب ہے کہ میں اب تک مالکن اور حویلی والوں کو اپنا آقا سمجھ کر ان کی صداؤں پر لبیک کہتا رہا ہوں اور وہ صدا جو مجھے اصلی آقا کی طرف بلاتی رہی اسے نظر انداز کرتا رہا۔ بلال کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ مولوی صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہنے لگا "مولوی صاحب! آپ کا بے حد شکریہ۔ آج آپ نے میری آنکھوں سے جہالت کے تمام پردے ہٹا کر مجھے سیدھا راستہ دکھا دیا بلکہ مجھے خود سے ملوا دیا" بلال خدا کا شکر گزار تھا کہ اس نے اسے بے حسی کی چادر تلے یونہی اندھیروں میں بھٹکنے کے لیے نہیں چھوڑ دیا۔ وہ مولوی صاحب کے ہاتھ عقیدت سے چومتے ہوئے کہنے لگا "مولوی صاحب! اب میں پر سکون ہوں۔ مسجد آنے والا بلال تو بندوں کا غلام تھا مگر مسجد سے اٹھ کر جانے والا بلال اب بندوں کا غلام نہیں صرف اپنے اللہ کا بندہ اور غلام ہے۔ یہ بلال مالکن کے فرائض بھی ادا کرے گا مگر اپنے مالک کے فرائض کی بروقت ادائیگی کے بعد"۔

مولوی صاحب نے بلال کو بڑھ کر گلے لگا لیا اور بولے! "بیٹا بھول تو مجھ سے بھی ہوئی۔ تمہارے خالی پیٹ اور دنیاوی ضرورتوں کا خیال تو مجھے رہا مگر افسوس..... تمہاری روح کو دین سے بہرہ مند کرنے اور آخرت کے بارے میں صحیح رہنمائی دینے کا خیال تک نہ آیا۔ خدا مجھے بھی معاف فرمائے۔ اب تم کب ملو گے؟" بلال نے مسکراتے ہوئے کہا..... ان شاء اللہ نماز مغرب پر پھر ملاقات ہو گی"۔ اب بلال دل و دماغ کی منور دنیا لیے گھر کی طرف لوٹ رہا تھا جہاں مالکن کی گرجدار اور غصیلی آوازیں پھر اس کی منتظر تھیں مگر بلال اپنی ہی دھن میں مست چلا جا رہا تھا کہ اس کے دل میں اپنے رب کو راضی کرنے کی دھن اور اس کی ناراضگی کا خوف کافی تھا۔

☆☆☆

فرق معلوم کیجیے فرق معلوم کیجیے فرق معلوم کیجیے

یہ دونوں تصویریں 12 جگہوں پر ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ذرا جلدی سے یہ فرق ڈھونڈ نکالیں.....!

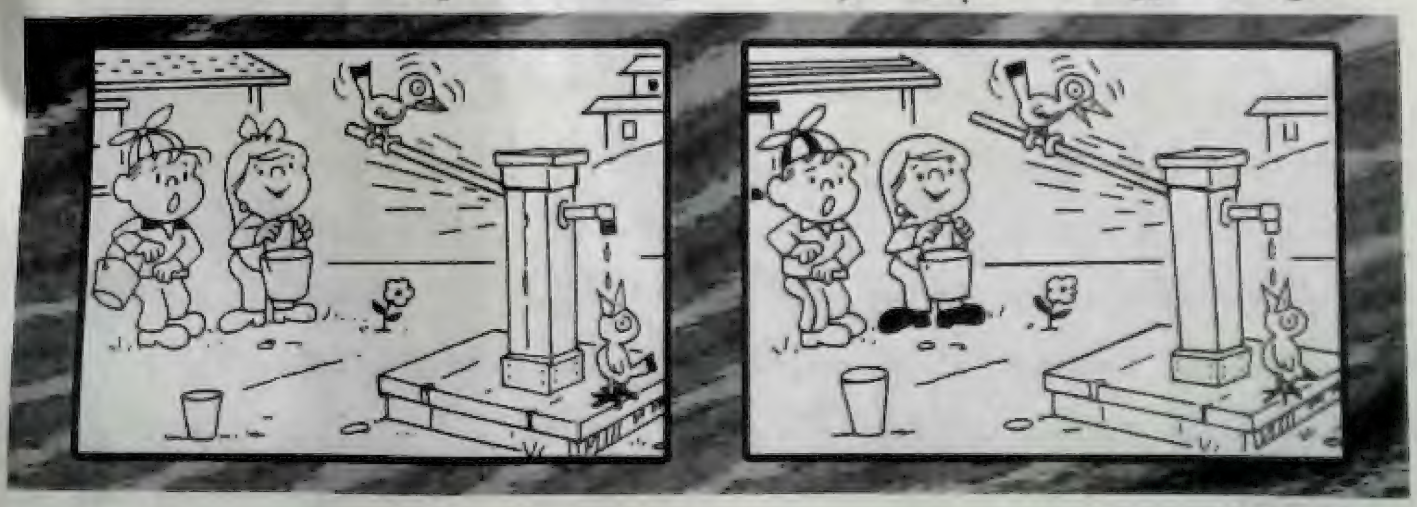

آداب ہمیں اچھی زندگی کا قرینہ سکھاتے ہیں۔

ہمیں اپنے اور دوسروں کے معاملات سمجھنے اور سلجھانے کا طریقہ بتاتے ہیں۔ آداب ہمارے اخلاق اور ہماری قومی زندگی کے محافظ ہیں۔ یہ ہمیں اچھی تربیت کے ذریعے سلیقہ مند، خوش اخلاق اور خوش اطوار بناتے ہیں!

یوں اسلامی آداب سیکھنے اور اپنانے سے ہم اچھے، صحت مند، باکردار اور بااخلاق مسلمان بننے کے ساتھ ساتھ بہتر اور پُروقار زندگی گزارنے کے قابل ہوتے ہیں۔ خدا اور اس کے پیارے رسول ﷺ کی پیاری تعلیمات زندگی کے جن آداب کا سبق دیتی ہیں وہ بلاشبہ ہماری بہتری اور کامیابی کو یقینی بناتے ہیں۔ ہم سب کو یہ آداب پورے شوق کے ساتھ سیکھنے اور اپنانے چاہیں۔ پیارے بچو! آؤ اب ہم ان آدابِ زندگی کا مطالعہ شروع کریں!

صفائی اور پاکیزگی کے آداب:

☆ آنحضور ﷺ کے ارشاد کے مطابق صفائی اور پاکیزگی آدھے ایمان کے برابر ہے۔ اللہ تعالیٰ خود پاک صاف ہیں اور صاف ستھری چیزیں ہی پسند کرتے ہیں۔ لہٰذا ہمیں بھی صفائی اور پاکیزگی کو عزیز رکھنا چاہیے۔ ہمیں چاہیے کہ خود بھی صفائی اور پاکیزگی کا خیال رکھیں اور صاف ستھرا رہنے والے لوگوں ہی کو اپنا دوست بنائیں!

☆ صبح سویرے جب آپ سو کر اٹھیں تو بسم اللہ اور کلمہ طیبہ پڑھ کر آنکھیں کھولیں اور نئے دن کو خوش آمدید کہیں۔

☆ سو کر اٹھنے کے بعد بغیر ہاتھ دھوئے کسی برتن میں ہاتھ نہ ڈالیں۔

☆ منہ کی صفائی نہایت ضروری ہے۔ آنحضور ﷺ نے مسواک کرنے کی سخت تاکید فرمائی ہے۔ اگر مسواک میسر نہ ہو تو کسی اچھے سے برش اور ٹوتھ پیسٹ سے منہ اور دانتوں کی اچھی طرح صفائی کر لیں۔

☆ اس کے بعد نماز فجر کے لیے تیاری کریں۔ نماز اگر مسجد میں جماعت کے ساتھ ادا کی جائے تو بہت بہتر ہے اور زیادہ ثواب کا ذریعہ بھی۔ اگر کبھی وقت کم ہو اور سورج نکلنے کا وقت قریب ہو تو پھر گھر پر ہی نماز پڑھ لیجئے۔ صبح کی نماز دن کے اچھے آغاز اور ذہنی اطمینان کا باعث بھی ہے۔

☆ نماز کے بعد اپنی سہولت کے مطابق کچھ وقت کے لیے تلاوتِ قرآن پاک بھی کریں۔ جس دن کا آغاز تلاوتِ قرآن پاک سے کیا جائے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس میں مسلمانوں کے لیے نہایت برکت، سلامتی اور کشادگی عطا کی جاتی ہے۔

☆ صبح کے وقت ہلکی پھلکی ورزش اور سیر بھی مفید عادت ہے۔

☆ صبح سویرے غسل کرنا نہایت مفید اور صحت کا ضامن ہے۔ ہر صبح باقاعدگی کے ساتھ غسل کریں۔ اس کے بعد صاف تولیے سے بدن پونچھیں اور کپڑے تبدیل کریں۔ گرمیوں کا موسم ہو تو روزانہ غسل کرنا چاہیے اگر موسم سرد ہو تو کم از کم ہفتہ میں ایک بار ضرور نہانا چاہیے۔

☆ غسل خانے میں پیشاب نہ کریں۔ اس سے گندے چھینٹے پڑنے اور ناپاکی کا خطرہ ہے۔

☆ عام راستوں پر یا سایہ دار درختوں کے نیچے پیشاب

کرنے سے بھی پرہیز کریں۔ لیٹرین میں جاتے وقت سر ڈھانپ لینا چاہیے۔

☆ جمعہ کے روز زیادہ اہتمام سے غسل کریں اور صاف ستھرا لباس پہن کر وقت سے ذرا پہلے مسجد میں جائیں تاکہ امام صاحب کا وعظ اور خطبہ پوری طرح سن سکیں۔ جمعہ کے روز درود شریف پڑھنا برکت اور ثواب کا باعث ہے۔

☆ سر کے بال دھونے کے بعد ان میں تیل لگائیں اور کنگھی بھی ضرور کریں۔ پیارے نبی ﷺ کو بغیر کنگھی کیے یا اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے بال ہرگز پسند نہیں تھے۔ ایسے لوگوں کو دیکھ کر جن کے بال خواہ مخواہ بڑھے ہوئے گندے یا بکھرے ہوئے ہوتے تو آپؐ سخت ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا کرتے تھے۔

☆ بالوں کی حجامت باقاعدگی کے ساتھ بنوایا کریں اور انہیں درست رکھیں۔

☆ آنکھوں میں سرمہ لگانا بھی حضورؐ کی پیاری عادت تھی۔

☆ ناخن ترشوا کر رکھیں اور ان کی صفائی کا خاص خیال رکھیں۔ گندے اور بڑھے ہوئے ناخن ناپاکی اور گندگی کی علامت ہیں۔

☆ اپنے اسکول یا کسی کام کاج کے لیے گھر سے نکلنا ہو تو پوری صفائی پاکیزگی اور اہتمام کے ساتھ تیار ہوں۔

☆ اپنی جسمانی صفائی ستھرائی کے ساتھ ساتھ اپنے گھربار اور اردگرد کے ماحول کی صفائی کا بھی خاص خیال رکھیں۔ آپ کی امی جان اور پیاری بہنیں گھر کی صفائی اور جھاڑ پونچھ میں مصروف رہتی ہوں گی۔ آپ کو بھی گھر کی صفائی میں دلچسپی لینی چاہیے اور گھر والوں سے تعاون کرنا چاہیے۔ ردی کاغذ' پھلوں کے چھلکے اور کاٹھ کباڑ گھر میں اِدھر اُدھر پھینکنے کے بجائے ردی کی ٹوکری میں ڈالتے جائیں اور شام کو کسی وقت کوڑا کرکٹ والے ڈرم میں ڈال دیا کریں۔ آپ نہ تو اپنے گھر میں گندگی پھیلائیں اور نہ ہی گھر کے باہر یا اردگرد کوڑا کرکٹ پھینکیں۔ یاد رکھیے! گھر اور اپنے اردگرد کے ماحول کو صاف ستھرا رکھنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا اپنے آپ کو!

☆ جگہ جگہ تھوکنا نہایت بری عادت ہے۔ اس سے گندگی اور گندے جراثیم پھیلتے ہیں۔ اِدھر اُدھر تھوکنے سے مکمل پرہیز کریں۔

☆ چھینک آنا اچھی صحت کی علامت ہے۔ چھینک کے بعد الحمد للہ کہہ کر اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ زیادہ زور لگا کر ہرگز نہ چھینکیں اور چھینکتے وقت منہ پر رومال ضرور رکھ لیا کریں۔

☆ ناک صاف کرنی ہو یا بلغم تھوکنی ہو تو ایک طرف ہو جایا کریں۔ زیادہ بہتر تو یہ ہے کہ نالی پر جا کر صفائی کی جائے اور بعد میں ہاتھ دھو لیے جائیں۔ رومال سے بھی کام لیا جا سکتا ہے۔ دوسرے لوگوں کے سامنے ایسی حرکت کرنا نہایت نامناسب ہے۔

☆ اپنی جماعت میں یا دوسری جگہوں پر لوگوں کے سامنے ناک میں انگلی ڈالنے اور ناک کی صفائی کرنے کی عادت بالکل چھوڑ دیں۔

☆ زیادہ پسینہ آیا ہوا ہو یا محنت مشقت اور دھوپ کی وجہ سے تھکن محسوس ہوتی ہو تو غسل کا اہتمام کرنا چاہیے۔

☆ بنیان ضرور استعمال کریں۔ بنیان جلدی جلدی بدلنے کی عادت ڈالیں۔ میلی کچیلی اور بدبودار بنیان ناگواری پیدا کرتی ہے۔

☆ کپڑے دھو کر زیادہ دیر تک بھگوئے نہ رکھیں۔ اس سے ان میں بدبو پیدا ہونے کا خدشہ ہے۔ بلکہ جلدی نچوڑ کر چمکتی اور کھلی دھوپ میں سوکھنے کے لیے ڈال دیں۔ تیز دھوپ کپڑے جلدی سکھانے اور جراثیم ختم کرنے میں مدد دیتی ہے۔

☆ اچھی بیٹیوں کے لیے مشورہ ہے کہ گھر کی جھاڑ پونچھ اور دوسرے کاموں میں اپنی امی اور باجیوں کا ہاتھ بٹایا کریں۔ گرد و غبار سے محفوظ رہنے کے لیے منہ ناک کپڑے سے ڈھانپ لیا کریں اور کام کے بعد منہ ہاتھ ضرور صابن سے دھو لیا کریں۔

☆ دن کے وقت ہمیشہ جوتا پہن کر رہیں اور گرد و غبار سے پرہیز کریں۔

☆ نہایت باقاعدگی اور شوق کے ساتھ پانچوں وقت نماز پڑھیں۔ وضو خوب اچھی طرح سے کریں۔ پیارے نبی ﷺ کا فرمان ہے۔

"اچھی طرح وضو کیا کرو۔ یہ تمہاری عمر کو بڑھا دے گا"۔

مطلب یہ ہے کہ مسلمان کے لیے وضو جسمانی صفائی اور پاکیزگی کا ذریعہ بھی ہے۔ ہم وضو کے دوران تمام اعضاء کم از کم تین بار ضرور دھوتے ہیں۔ پانچوں نمازوں کے لیے وضو بھی کرنا ہوتا ہے۔ اس طرح صفائی اور پاکیزگی کی بدولت ہماری صحت نہایت اچھی رہتی ہے۔ صحت اچھی ہو تو انسان خوش و خرم رہتا ہے اور یہی لمبی عمر کا اصل راز ہے۔

(باقی آئندہ)

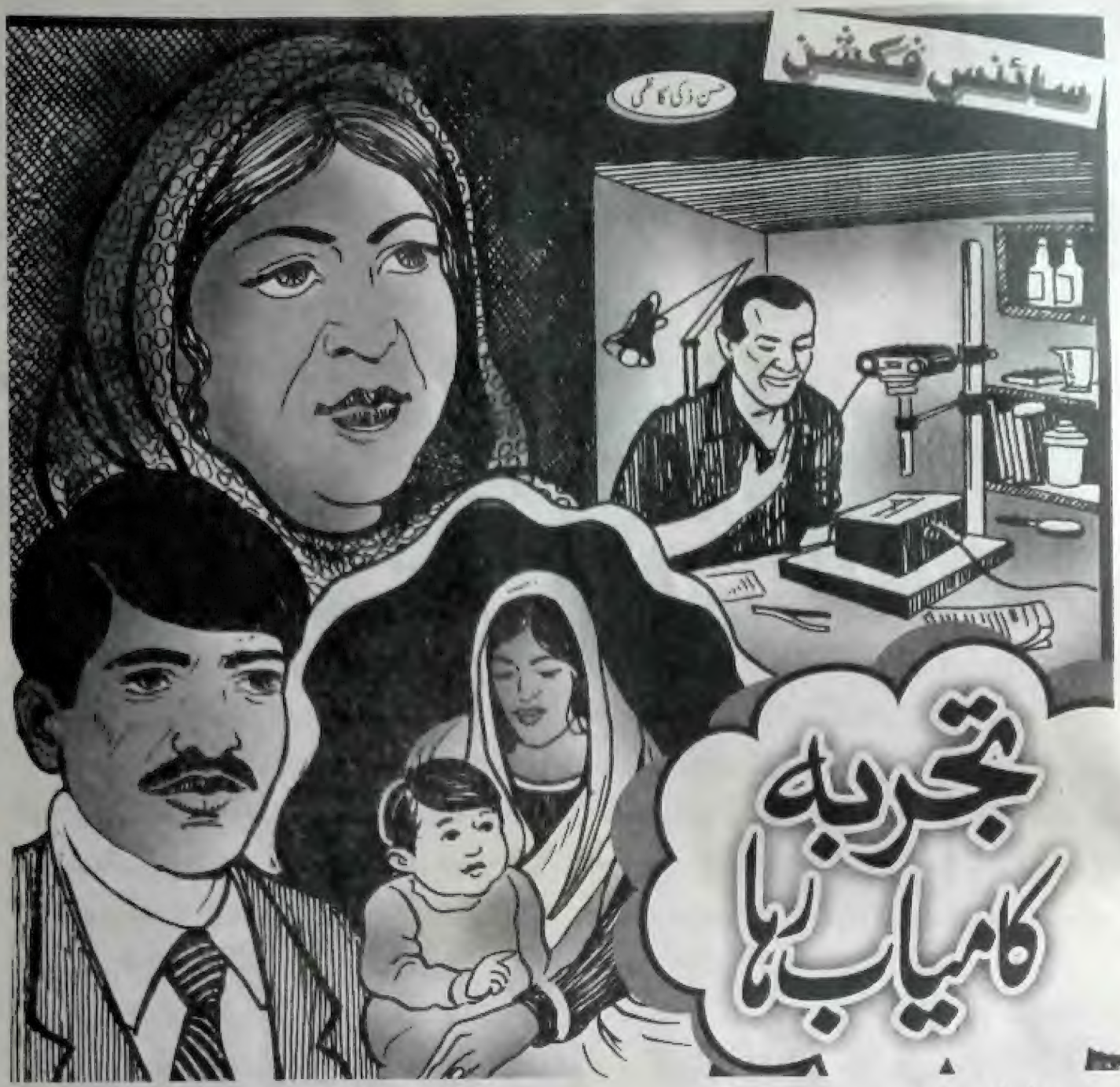

عادل نے فون کا ریسیور اٹھا کر کہا "ہلو"۔

ادھر سے آواز آئی "بیٹے! میں عمران کی امی بول رہی ہوں"۔

عادل نے ہنستے ہوئے کہا "جی، السلام علیکم امی، آپ کمال کرتی ہیں۔ اب آپ کو بھی یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ کون بول رہا ہے؟ کہیے کیسی ہیں آپ؟"

زبیدہ خاتون نے بھی ہلکے پھلکے انداز میں کہا "وعلیکم السلام، جیتے رہو۔ ارے، میں نے سوچا دفتر میں ہزاروں فون آتے ہوں گے۔ پتا نہیں آواز پہچانو یا نہیں"۔

عادل نے جواب دیا "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ آپ کی آواز ہزاروں میں کیا، لاکھوں کروڑوں میں پہچان لوں — اچھا، یہ بتائیے کیسے زحمت کی آپ نے؟"

عادل کی بات کا جواب دینے کے بجائے زبیدہ خاتون نے الٹا اس سے سوال کیا۔

"تو کیا عمران نے تم سے بات نہیں کی؟" اور پھر عادل کے "جی نہیں" کہنے پر انہوں نے اپنی بات جاری رکھی۔

"بڑا بھلکڑ ہے یہ عمران۔ کوئی بات یاد ہی نہیں رکھتا۔ خیر چھوڑو...... بات یہ ہے کہ لندن سے ہمارے ایک عزیز آئے ہوئے ہیں۔ وہ وہاں سائنس کے کسی شعبے میں استاد ہیں۔ انہوں نے مجھ سے فرمائش کر دی کہ انہیں ساگ اور مکئی کی روٹی

کھلاؤں۔ کل دوپہر میں آرہے ہیں وہ ہمارے گھر۔ میں نے سوچا' تم تو ساگ اور مکئی کی روٹی کے اس شہر میں سب سے بڑے شوقین ہو لہٰذا تمہیں اطلاع کر دی جائے۔ کل تمہاری چھٹی بھی ہے۔ پھر کیا خیال ہے؟"

عادل تو خوشی سے اچھل پڑا اور بولا "امی! نیکی اور پوچھ پوچھ..... اجی' میں تو سر کے بل آؤں گا۔ ساگ اور روٹی اور وہ بھی آپ کے ہاتھ کی..... بھلا کون کم بخت چھوڑے گا اس نعمت کو؟"

دوسرے دن عادل عمران کے گھر پہنچا تو پروفیسر عظیم وہاں پہلے سے موجود تھے۔ عادل نے تعارف کے بعد تھوڑی سی شرمندگی کے ساتھ کہا:

"معاف کیجئے گا پروفیسر صاحب' مجھے کچھ دیر ہو گئی۔ آپ تو بالکل انگریزوں کی طرح وقت کی پابندی سے پہنچ گئے"۔

پروفیسر نے پہلے تو عادل کو غور سے دیکھا اور پھر بڑی شفقت سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے:

"ینگ مین! یہ آپ سے کس نے کہہ دیا کہ وقت کی پابندی بس انگریز ہی کرتا ہے یا صرف یورپ والے ہی کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے وقت کی پابندی ہر وہ شخص کرتا ہے جسے اپنے اور دوسرے کے وقت کی قیمت کا صحیح اندازہ ہو۔ خواہ اس کا تعلق افریقہ سے ہو یا ایشیا سے یا مغربی دنیا سے"۔

بات ذرا کڑوی تھی لیکن پروفیسر صاحب نے اتنے اچھے انداز سے کی کہ عادل کے دل کو بھا گئی اور تھوڑی ہی دیر میں اس کی پروفیسر سے دوستی ہو گئی۔

پروفیسر عظیم کو ملک سے باہر گئے مدت گزر گئی تھی۔ پہلے وہ سائنس کے مختلف مضمونوں میں تعلیم حاصل کرتے رہے اور اب ایک عرصہ سے تحقیق کا سلسلہ جاری تھا۔ باتوں باتوں میں پروفیسر کو یہ معلوم ہوا کہ بچپن میں عادل اپنے والدین کے ساتھ ڈھاکہ میں رہتا تھا۔ جب مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بنا تو اس کی عمر پانچ سال تھی۔ باپ کا انتقال ایک سال پہلے ہو گیا تھا۔ ماں اس کا سب کچھ تھی لیکن بدقسمتی یہ ہوئی کہ اس افراتفری میں وہ ماں سے بھی بچھڑ گیا۔ وہ اپنے ماموں کے ساتھ کراچی پہنچ گیا۔ ماں بنگلہ دیش میں رہ گئی یا پاکستان آ گئی' اللہ بہتر جانتا ہے۔ عادل کو تو بس یہ معلوم ہے کہ برسوں کی تلاش کے باوجود وہ ماں کے پیار کو ترستا ہی رہا۔ ترستے ترستے بچپن سے جوانی میں قدم رکھا اور اب جوانی بھی ختم ہو رہی تھی۔ وہ عمر کے چالیس سال پورے کر چکا تھا۔ شادی ہوئی' بچے ہوئے' گھر تھا' پیسہ تھا' آرام تھا لیکن زندگی میں ایک ایسی کمی تھی جو ہمیشہ اسے ستاتی رہی اور وہ تھی مامتا سے محرومی..... زندگی بھر یہ خیال اسے پریشان کیے رہا کہ اس کی ماں زندہ ہے یا مر چکی؟ اور اگر زندہ ہے تو کہاں ہے؟ کس حال میں ہے؟ اس نے کبھی اپنے بیٹے کو تلاش کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟ پھر اس نے پروفیسر عظیم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

"اب تو میں ماں کی وہ شکل بھی بھولنے لگا جو پانچ سال کی عمر میں دیکھی تھی۔ سارے نقش دھندلانے لگے ہیں۔ البتہ میرے پاس ماں کے بچپن کی چند تصویریں ہیں اور ایک دو ان کے کالج کے زمانے کی۔ بس جب پریشان ہوتا ہوں تو انہیں نکال کر دیکھ لیتا ہوں۔ کچھ سکون مل جاتا ہے' کچھ ڈھارس بندھ جاتی ہے۔ اکثر ایک عجیب احمقانہ خیال دل میں آتا ہے....."

عادل نے بات مکمل نہیں کی اور کسی سوچ میں کھو گیا۔ پروفیسر عظیم اپنی جگہ سے اٹھ کر عادل کے بالکل قریب آگئے اور بڑی ہمدردی سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بولے:

"برخوردار! ہمیں بھی تو بتاؤ وہ احمقانہ خیال کیا ہے؟"

عادل کے چہرے پر بڑی پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا "ایسے ہی کبھی کبھی یہ خیال آتا ہے کہ ماں سے ملنے اور انہیں دیکھنے کی تو کوئی امید نہیں۔ کاش کہیں سے ان کی بڑی عمر کی کوئی تصویر ہی مل جائے جسے میں ہمیشہ اپنی نظروں کے سامنے رکھوں۔ شاید اس سے ہی میرے دل کو کچھ تسلی ہو"۔

پروفیسر عظیم نے شفقت سے عادل کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "میاں! یہ خواہش احمقانہ تو ہرگز نہیں۔ بڑی معصوم سی خواہش ہے۔ میں دعا کروں گا کہ نہ صرف یہ خواہش پوری ہو بلکہ تصویر کے بجائے خود تمہاری ماں تمہیں مل جائے۔ دیکھو اللہ کی رحمت سے کبھی مایوس نہیں ہونا چاہیے"۔

پروفیسر نے محسوس کیا کہ ماحول بڑا بوجھل ہو گیا ہے لہٰذا انہوں نے موضوع بدلا اور ساگ کی تعریفیں شروع کر دیں۔

عادل بھی ان تعریفوں میں شامل ہو گیا۔

"بس ساگ تو امی کے مقابلے کا کوئی پکا ہی نہیں سکتا اور مجھے تو یہ اتنے پیار سے بلاتی اور کھلاتی ہیں کہ مزا دگنا ہو جاتا ہے۔ اگر بنگلہ دیش سے یہاں آکر ان سے ملاقات نہ ہوتی تو زندگی میں میری محرومی اور بھی بڑھ جاتی۔ آپ یقین جانئے کہ یہ مجھے عمران سے کم نہیں سمجھتیں"۔

کچھ دیر اسی طرح باتیں ہوتی رہیں اور پھر پروفیسر عظیم رخصت ہوتے ہوئے بولے:

"اچھا عادل میاں! انشاء اللہ جلد ہی ملاقات ہو گی۔ ابھی تو میں اپنے کام کے سلسلے میں تقریباً دو ڈھائی مہینے رہوں گا آپ کے شہر میں"۔

چھ سات دن گزرے تھے کہ عمران نے عادل کو پروفیسر عظیم کا پیغام دیا۔ "یار! وہ ہمارے پروفیسر صاحب ہیں نا۔ انہوں نے کہا ہے کہ اگر تم مناسب سمجھو تو اپنی والدہ اور ماموں کی وہ سب تصویریں جو تمہارے پاس ہیں چند ہفتے کے لیے انہیں دے دو۔ وہ بڑی احتیاط سے تمہیں واپس کر دیں گے"۔

عادل نے کچھ حیران ہو کر عمران کی طرف دیکھا اور بولا: "ماموں اور میری ماں کی تصویروں سے پروفیسر صاحب کو کیا سروکار؟"

عمران نے جواب دیا "یہی سوال میں خود پروفیسر عظیم سے کرنے والا تھا لیکن پھر خیال آیا کہ شاید تم سے اس بارے میں کوئی بات ہوئی ہو"۔

عادل نے "نہیں" میں سر ہلایا اور کچھ سوچنے لگا۔ پھر بولا: "ہے تو عجیب سی بات۔ لیکن پروفیسر کی بات ٹالتے ہوئے بھی اچھا نہیں لگتا۔ تمہاری کیا رائے ہے؟"

عمران نے چند لمحے سوچا اور پھر کہنے لگا "میرے خیال میں تو کوئی حرج نہیں۔ یقیناً کوئی بات ہو گی پروفیسر کے ذہن میں۔ آج ہی دے دو ساری تصویریں"۔

ایک ہفتہ گزرا، دو ہفتے گزرے، تین ہفتے گزرے۔ اور اب عادل کی بے چینی بڑھنے لگی۔ یہ اس کی عادت بن گئی تھی کہ وہ ہفتے میں ایک آدھ بار ماں کی تصویریں نکال کر دیکھ لیتا تھا اور کبھی

حسن ذکی کاظمی

ممتاز براڈکاسٹر اور ادیب جناب حسن ذکی کاظمی کا نام بچوں کے ادب میں سرفہرست قرار دیا جاتا ہے۔ جدید سائنسی ریسرچ کے پس منظر میں لکھی ہوئی ان کی دلچسپ کہانیاں سائنس فکشن کے طور پر بچوں میں بے حد مقبول ہیں۔

کبھی تو ایک بچے کی طرح ان سے باتیں بھی کرتا تھا۔ اب لگاتار تین ہفتے گزر چکے تھے اسے ماں کی تصویر دیکھے بغیر۔ بے اختیار اس کا دل چاہا کہ ماں سے باتیں کرے۔ پھر اسے یہ بھی خیال آیا کہ پروفیسر صاحب نے کہیں اس کا بیش قیمت سرمایہ لاپرواہی سے اِدھر اُدھر نہ ڈال دیا ہو۔ بہرحال اس نے جذبات پر قابو پایا اور اپنے کاموں میں لگ گیا۔ لیکن جب ایک ہفتہ اور گزرا تو عادل سے مزید صبر نہ ہو سکا۔ اس نے بغیر کسی ارادے کے پروفیسر کا موبائل فون ملا لیا۔

"السلام علیکم! میں عادل بول رہا ہوں"۔

"ہاں ہاں..... عادل میاں..... کیا حال ہیں..... ارے بھائی بڑے بے مروت ہو۔ اس دن کے بعد ملے ہی نہیں۔ کبھی آجاؤ میاں!"۔

پروفیسر صاحب بولے چلے جا رہے تھے لیکن تصویریوں کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ عادل کو کوفت ہونے لگی۔ اس نے ذرا بے صبری سے کہا "پروفیسر صاحب وہ آپ نے عمران کے ذریعے ماں کی تصویریں....."۔

پروفیسر نے بات کاٹتے ہوئے بڑی بے پرواہی سے کہا: "ہاں ہاں رکھی ہیں..... فکر نہ کرو..... لے لینا"۔

عادل کے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے لگا "تو آپ نے جس مقصد کے لیے تصویریں لی تھیں اس میں کچھ کامیابی ہوئی؟"

"مقصد؟" پروفیسر عظیم کچھ چونک سے گئے اور بولے:

"کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ دیکھو کیا نتیجہ نکلتا ہے؟ خیر چھوڑو۔ یہ بتاؤ کب ملو گے؟" میرا خیال ہے دو تین دن میں آجاؤ۔ ملاقات بھی ہو جائے گی' تصویریں بھی لے جانا"۔

یہ دو تین دن بڑی بے چینی سے گزرے۔ پروفیسر کی باتوں نے عادل کو الجھن میں ڈال دیا تھا۔ وہ صاف بات ہی نہیں کر رہے تھے۔ تصویریں انہوں نے کیوں لی تھیں؟ اس بات کو انہوں نے ایک معما بنا دیا تھا۔

تیسرے دن عادل عمران کو ساتھ لے کر پروفیسر عظیم کے پاس پہنچا۔ پروفیسر صاحب دونوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے

"ویلکم میں — کیسے ہو تم لوگ؟ امی کیسی ہیں؟ اچھا یہ بتاؤ کیا پیو گے' کیا کھاؤ گے؟"

باتیں کرتے کرتے پروفیسر نے میز کی دراز کھولی اور کچھ کے بغیر تصویروں کا لفافہ عادل کی طرف بڑھا دیا۔ پھر بولے:

"عادل میاں! دیکھ لو۔ تصویریں پوری ہیں"۔

عادل نے پیکٹ اپنے بیگ میں ڈالتے ہوئے کہا:

"تصویریں تو پوری ہی ہوں گی۔ آپ تو یہ بتائیے کہ آپ کو ان کی ضرورت کیوں پڑ گئی تھی؟"

پروفیسر عظیم ہنس دیئے اور چھت کی طرف دیکھتے ہوئے بولے "تجربہ' تحقیق' کھوج — ارے میاں زندگی اسی میں گزر گئی۔ خیر چھوڑو۔ کبھی فرصت سے باتیں کروں گا اپنی اس زندگی کے بارے میں — ہاں تم دونوں نے بتایا نہیں کیا پیو گے؟ اور ہاں عادل میاں! تصویریں چیک کر لینا۔ کوئی کم نہ ہو۔ بھئی دراصل یہ پچھلے چند دنوں میں کئی ہاتھوں سے گزری ہیں"۔

عادل کو تعجب ہوا کہ پروفیسر اس کی ماں کی تصویریں خواہ مخواہ دوسروں کو کیوں دیتے رہے اور مقصد کیا تھا؟ لیکن انہوں نے اس بات کی وضاحت کرنے کے بجائے اسے ایک معما بنایا ہوا تھا۔ عادل اور عمران رخصت ہونے لگے تو پروفیسر نے شیلف سے دو پیکٹ اٹھا کر ایک عمران کو دیا اور دوسرا عادل کو اور بڑی محبت سے بولے۔

"وقت بڑی تیزی سے گزر رہا تھا۔ پتا نہیں کب واپس چلا جاؤں اور پھر کب ملاقات ہو؟ یہ چیزیں میں اس لیے تمہیں دے رہا ہوں کہ انہیں دیکھ کر شاید کبھی ہماری یاد آجائے۔ انہیں گھر پہنچ کر دیکھنا"۔

عمران اور عادل نے شکریہ ادا کیا اور پھر ملنے کا وعدہ کر کے روانہ ہو گئے۔ گھر پہنچے تو امی کھانے کی میز سجائے بیٹھی تھیں۔ کہنے لگیں "بڑی دیر لگا دی۔ کھانا بالکل ٹھنڈا ہو گیا چلو تم دونوں میز کی طرف چلو۔ میں گرم روٹی لے کر آتی ہوں"

نہیں امی پہلے ہم ذرا پروفیسر صاحب کے تحفے دیکھ لیں۔ پھر کھانا کھائیں گے۔ جہاں اتنی دیر ہوئی ہے وہاں تھوڑی دیر اور

سہی"۔

یہ کہہ کر پہلے عمران نے جلدی جلدی اپنا پیکٹ کھولا۔ اس میں انگریزی شاعری کے بارے میں ایک خوبصورت کتاب تھی جسے سب نے بہت پسند کیا۔ پھر عادل نے اپنا پیکٹ کھولا۔ ایک قیمتی فریم میں پینسٹھ ستر سال کی ایک خوش شکل اور باوقار خاتون کی تصویر تھی جس کی شکل میں عادل کی کافی شباہت نظر آتی تھی۔ عادل حیران اور پریشان ہو کر دیر تک یہ تصویر دیکھتا رہا۔ پھر اس نے تصویر عمران کی امی کے ہاتھ میں تھما کر پروفیسر کو فون ملایا۔

"پروفیسر صاحب! آپ کے تحفے کا ایک بار پھر شکریہ لیکن میں کچھ سمجھ نہیں سکا"۔

پروفیسر نے جواب دیا "بھئی' اس میں سمجھنے کی کیا بات ہے۔ یوں سمجھو کہ تمہاری "احمقانہ" خواہش پوری ہو گئی۔ تمہاری امی کی تازہ تصویر تمہیں مل گئی۔ اب اسے اپنے کمرے میں سجاؤ"۔

عادل کی حیرانی کم نہ ہوئی "لیکن آپ کو ماں کی یہ تصویر ملی کہاں سے؟ یہ معما تو حل کر دیجئے"۔

پروفیسر نے کہا "یہ معما ابھی نہیں حل ہو گا۔ تم اور عمران پرسوں ٹھیک دس بجے صبح علی آڈی ٹوریم پہنچو۔ اس کا حل تمہیں ملے گا"۔ یہ کہہ کر پروفیسر نے فون بند کر دیا۔

دو دن بعد ٹھیک دس بجے عادل اور عمران آڈی ٹوریم پہنچے تو اسٹیج پر پروفیسر عظیم اور دو مقامی پروفیسر بیٹھے تھے۔ چند منٹ بعد پریس کانفرنس شروع ہو گئی۔ پروفیسر عظیم نے بولنا شروع کیا: "جس تکنیک کے بارے میں اس وقت بات کروں گا اسے "ایج پروگریشن" (Age Progression) کا نام دیا گیا ہے۔ اس تکنیک پر کئی سال سے کام ہو رہا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ جو لوگ بچپن یا جوانی میں گم ہو جاتے ہیں یا دنیا سے چلے جاتے ہیں ان کے بارے میں دس بیس تیس یا پچاس ساٹھ سال بعد یہ اندازہ لگایا جائے کہ اگر وہ اس وقت زندہ ہوتے تو ان کی شکل و صورت کیسی ہوتی؟ آپ میں سے کئی لوگوں نے اس تکنیک کے بارے میں سنا اور پڑھا ہو گا۔ دراصل اس کا مقصد یہ ہے کہ ان لوگوں کو جو عمر کے شروع حصے میں کھو گئے تھے یا اپنے عزیزوں سے بچھڑ گئے تھے' اگر وہ زندہ ہوں تو انہیں دوبارہ اپنے خاندان والوں سے ملا دیا جائے۔

یہ تکنیک آرٹ اور سائنس دونوں کی مدد سے تیار ہوئی ہے۔ ایک طرف اس میں اس شخص کی بچپن اور نوجوانی کی تصویروں' اس کے والدین اور بھائی بہنوں کی تصویروں یا اولاد کی تصویروں سے مدد لی جاتی ہے اور دوسری طرف کمپیوٹر سے پھر اندازہ لگایا جاتا ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ اس کے چہرے اور اس کے نقوش میں کیا تبدیلی آسکتی ہے؟ یعنی بچپن کے بعد نوجوانی' پھر جوانی' پھر ادھیڑ عمر اور پھر بڑھاپے میں اس کا چہرہ کیسا ہو سکتا ہے؟"

پروفیسر عظیم دیر تک اس تکنیک کی تفصیل اور باریکیاں بتاتے رہے اور پھر انہوں نے اخباری نمائندوں کو چند تصویریں دکھائیں جو انہوں نے مقامی آرٹسٹوں اور سائنس دانوں کی مدد سے تیار کی تھیں۔ ان میں اس تصویر کی کاپی بھی تھی جو انہوں نے عادل کو دی تھی۔ ساتھ ہی پروفیسر نے یہ بھی کہا کہ مجھے ابھی یہ اندازہ نہیں کہ ہمارا یہ تجربہ کامیاب رہا یا نہیں اور کامیاب رہا تو کس حد تک؟ تھوڑی دیر تک پروفیسر عظیم اور ان کے ساتھی اخباری نمائندوں کے سوالوں کے جواب دیتے رہے اور پھر پریس کانفرنس ختم ہو گئی۔

اسی دن شام کو ایک اخباری نمائندہ پروفیسر عظیم سے ملنے آیا اور دیر تک یہ دونوں اکیلے بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ اسی دوران پروفیسر نے ادھر ادھر کئی ٹیلی فون بھی کیے۔

تھوڑی دیر بعد ایک کار' فردوس' نامی ادارے کے باہر آکر رکی اور اس میں سے پروفیسر عظیم' اخباری نمائندہ' عادل اور عمران اور اس کی امی اترے۔ اخباری نمائندے کے پیچھے یہ سب ادارے کی عمارت میں داخل ہو گئے۔

ملاقاتیوں کے کمرے کا دروازہ کھلا اور ادارے کے منتظم ایک خاتون کو ساتھ لیے داخل ہوئے۔ پروفیسر عمران امی اور عادل حیرت سے ان خاتون کو تکنے لگے۔ اخباری نمائندے نے بولنا شروع کیا:

"بے چاری نہ جانے کب سے الزائمرز یعنی نسیان کی

مریض ہیں۔ انہیں کچھ بھی تو یاد نہیں۔ قابلِ رحم زندگی ہے۔ آج تک کسی عزیز رشتہ دار کا پتا نہیں چل سکا۔ اللہ کرے کہ اب......" اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ باقی سب لوگ پروفیسر کی بنائی ہوئی تصویر سے ان خاتون کی شکل ملا رہے تھے۔ وہی آنکھیں، وہی ناک، وہی ہونٹ، وہی ابھری ہوئی گالوں کی ہڈی۔ ہر نقش وہی۔ ہاں فرق تھا تو چہرے کی شادابی میں۔ تصویر ایک صحت مند اور خوش و خرم خاتون کی تھی جبکہ ان لوگوں کے سامنے ایک غمزدہ اور مرجھایا ہوا چہرہ تھا۔ چند منٹ کمرے میں مکمل خاموشی رہی۔ پھر اچانک عادل نے آگے بڑھ کر ان خاتون کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور انہیں چومنے لگا۔ چند لمحوں میں ان کے ہاتھ ایسے بھیگے جیسے ابھی دھو کر آئی ہوں اور انہیں خشک کرنا بھول گئی ہوں۔ آنسوؤں کا طوفان امڈ آیا تھا۔ خاتون بالکل خاموش بیٹھی تھیں۔ نہ ان کے چہرے پر کوئی جذبات تھے اور نہ جسم میں کوئی حرکت۔ کمرے میں مکمل خاموشی تھی جو کبھی کبھی عادل کی سسکیوں سے ٹوٹ جاتی تھی۔ اچانک ان خاتون نے اپنا داہنا ہاتھ عادل کے ہاتھ سے چھڑایا اور اسے آہستہ آہستہ عادل کے سر پر پھیرنا شروع کر دیا۔ چند لمحے بعد وہ دونوں ہاتھوں سے اس کے سر کو اپنے قریب لائیں اور اپنے سینے سے لگا لیا۔ اب عادل کی سسکیوں میں ان خاتون کی سسکیاں بھی شامل ہو گئی تھیں۔ پروفیسر عظیم اپنی جگہ سے اٹھ کر عادل کے پاس گئے اور بڑے جذباتی انداز میں بولے:

"اللہ کا شکر ہے میرا تجربہ کامیاب رہا۔"

☆☆☆☆☆☆

سہیلی بوجھ پہیلی!

1- نہر کنارے دیکھا چیتا
ہر وقت جو ہے پانی پیتا
جب بھر جائے اس کا پیٹ
کمر سے لگ کر جائے لیٹ

2- ایک جگہ پر لیٹی لیٹی دلی کو چھو آئے
سارے اس کی چھاتی کوٹیں وہ غصہ نہ کھائے

3- ایک جانور ہے بہت نرالا
منہ ہے اس کا ہندسوں والا
سارا دن ہے ٹک ٹک کرتا
پھر بھی اس کا منہ نہیں تھکتا

4- گرمیاں ہوں یا موسم سرما
آگ ہی تاپنا کام ہے اس کا
شکل ہے گول اور رنگ ہے کالا
بتلاؤ کیا نام ہے اس کا؟

5- راجا رانی کہو کہانی
ایک گھڑے میں دو رنگ پانی

جوابات پہیلیاں: 1- مشک۔ 2- سڑک 3- گھڑی 4- توا 5- انڈا

دنیا میں جگہ جگہ مقبروں یادگاروں اور مجسموں کی بھرمار ہے۔ لیکن ان میں سب سے زیادہ دلچسپ مقبرے اور مجسمے وہ ہیں جو جانوروں کی یاد میں بنائے گئے ہیں۔

روس کے شمالی اور برف سے ڈھکے ہوئے بنجر علاقے میں ایک جزیرہ "نارتھ برگ" ہے۔ یہاں ایک شہد کی مکھی کا مقبرہ ہے۔ یہ کوئی معمولی مکھی نہیں تھی بلکہ ملکہ ہونے کے علاوہ یہ اپنی پچاس خادماؤں کے ساتھ دنیا کی تاریخ میں پہلی مرتبہ اتنے سرد علاقے تک پہنچی۔ 1925ء میں انگلستان سے ایک قافلہ قطب شمالی کی سیاحت کے لیے روانہ ہوا۔ اس نے دوسرے تجربات کے علاوہ یہ تجربہ بھی کیا کہ شہد کی مکھیاں کتنی سردی برداشت کر سکتی ہیں۔ جزیرے پر پہنچتے ہی ساری مکھیاں مر گئیں۔ قافلے کے لیڈر نے مکھیوں کی ملکہ کو پہلے تو ایک بوتل میں اسپرٹ ڈال کر بند کیا۔ پھر بوتل کو ایک صندوق میں بند کر کے دفن کیا۔ پھر اس قبر پر ایک مقبرہ تعمیر کیا گیا جس پر کتبہ بھی لگایا گیا۔ اس مکھی کی یاد میں تعمیر کیے گئے مقبرے کو "بائنٹ ایپس" کہا جاتا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ دنیا اس بہادر مکھی کو نہ بھولے۔

روم کے مشہور شاعر ورجل نے ایک مکھی پال رکھی تھی۔ یہ مکھی کسی خاص نسل کی نہیں تھی بلکہ عام گھریلو مکھی تھی۔ اچانک وہ مکھی مر گئی۔ ورجل نے اس کا جنازہ بڑی دھوم دھام سے نکالا اور اس پر اس قدر روپیہ خرچ کیا کہ روم کے دولت مند لوگ بھی دانتوں تلے انگلی دبا کر رہ گئے۔

اس مکھی کو چاندی کے ایک ڈبے میں لٹایا گیا اور روم کے مشہور اور نامور آدمی اس کا جنازہ لے کر سڑکوں سے گزرے۔ چاندی کا یہ تابوت قبر میں رکھنے کے بعد تقریریں کی گئیں اور مکھی کی یاد میں ایک بڑا جلسہ کیا گیا۔ اس کے بعد ورجل نے روم کے ایک مشہور معمار سے اس کا مقبرہ تعمیر کرایا۔ کچھ ہی دنوں بعد ان لوگوں نے ورجل کی اس "حماقت" کی داد دی۔ کیونکہ حکومت نے اس زمانے میں قانون بنایا کہ امیر لوگوں کی جائیدادیں ضبط کر کے غریبوں میں تقسیم کی جائیں گی مگر حکومت نے ہر اس زمین کو اس قانون سے مستثنیٰ قرار دیا جو مقبروں کے اردگرد ہو۔ جب ورجل کی جائیداد کا مسئلہ پیدا ہوا تو اس نے حکومت کو یہی بتایا کہ میری جائیداد ضبط نہیں کی جا سکتی کیونکہ میری یہ زمین مقبرے کے

ارد گرد ہے۔ حکومت کو قانوناً یہ تسلیم کرنا پڑا اور اس طرح ورجل کی "حماقت" فائدہ مند ثابت ہوئی۔

امریکا میں کنساس سٹی جاتے ہوئے بیل کا ایک زبردست مجسمہ دکھائی دیتا ہے۔ یہ بیل 90 فٹ اونچے چبوترے پر کھڑا ہوا ہے۔ اس مجسمے کا وزن چار ٹن ہے اور یہ اس بات کی یادگار ہے کہ بیلوں کے ذریعے اس علاقے نے کتنی ترقی کی ہے۔

اسی طرح امریکا میں ایک اور جگہ پر گائے کا مقبرہ ہے۔ یہ اس وجہ سے تعمیر کیا گیا کہ اس گائے کے ذریعے اس کے مالک نے بڑی دولت کمائی۔ یہ گائے دس گائیوں کے برابر دودھ دیتی تھی۔ دو سال میں اس نے اتنا دودھ دیا تھا کہ جس سے 36 من مکھن نکالا گیا۔

امریکا کے کپاس والے علاقے میں ایک مقبرہ اس کیڑے کا بھی ہے جو کپاس کے پودے کا دشمن ہے۔ دشمن کی یہ عزت افزائی سمجھ میں نہیں آئی۔ 1923ء میں کپاس کی فصل پر ان کیڑوں نے ایسا حملہ کیا کہ پوری فصل تباہ ہو گئی۔ یہی نہیں کہ پوری فصل تباہ ہو گئی بلکہ آئندہ یہاں فصلیں نہیں لگائی جا سکتی تھیں۔ اب تو علاقے میں ہلچل مچ گئی۔ اس وقت سوچا گیا کہ کپاس کی فصل کے بجائے گنا' آلو اور مٹر کی کاشت کی جائے۔ اس تبدیلی کے باعث اس علاقے کی خوشحالی کی کوئی انتہا نہ رہی مگر یہ لوگ احسان فراموش نہ تھے۔ انہوں نے اپنے دشمن کی اس خدمت کا بدلہ اس صورت میں دیا کہ اس کا مقبرہ تعمیر کرا دیا تھا تاکہ دنیا یہ دیکھ لے کہ دشمنی بھی کس قدر فائدے مند ثابت ہو سکتی ہے۔

سالٹ لیک سٹی کے رہنے والوں نے سمندر کی چڑیوں کا ایک مقبرہ تعمیر کرایا۔ واقعہ یہ تھا کہ ابتدائی زمانے میں جب نو آباد لوگ زندگی کی سخت ترین کشمکش میں تھے تو انہوں نے دیکھا کہ وہ فصلیں جو انہوں نے اپنے خون پسینے سے تیار کی تھیں ٹڈی کی نذر ہوتی جا رہی ہیں۔ ٹڈیاں اس قدر آگئیں کہ خیال تھا کہ کچھ ہی منٹوں میں ڈنٹھل بھی نہیں بچے گا۔ اتنے میں ایک عجیب بات یہ ہوئی کہ سمندری چڑیوں کا ایک زبردست غول آتا دکھائی دیا۔ یہ چڑیاں اس قدر زیادہ تعداد میں تھیں کہ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے دنیا بھر کے سمندروں کی چڑیاں جمع ہو گئی ہیں۔ ان چڑیوں نے ٹڈیوں پر ایسا زبردست حملہ کیا اور کہ کچھ ہی دیر بعد ایک ٹڈی بھی زندہ نہ بچی۔ اس طرح فصلیں بچ گئیں۔

چڑیوں کی اس خدمت کی داد یہاں کے لوگوں نے اس طرح دی کہ ان کی ایک شاندار یادگار تعمیر کرائی جس پر دو چڑیوں کے مجسمے بنے ہوئے ہیں۔

☆☆☆

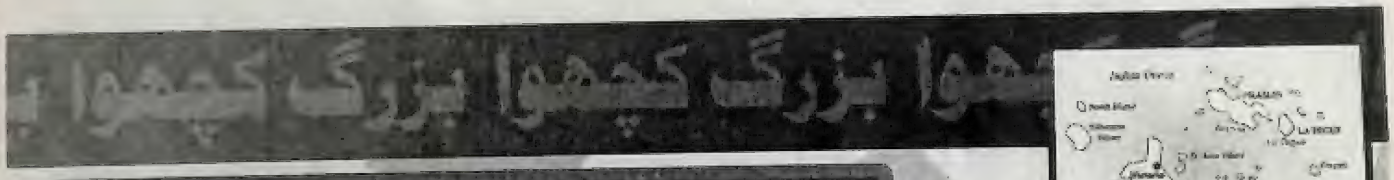

جزائر سیکلیز کا
بزرگ کچھوا

بچوا میں کچھوؤں کے پردادے کا بھی پردادا ہوں۔ جی ہاں' اس لیے کہ میری عمر 255 سال ہے یعنی اڑھائی صدیوں سے بھی زیادہ۔ میں جزائر Seychelles (بحر ہند) کا رہائشی ہوں اور گزشتہ 130 سال میں نے چڑیا گھر میں گزارے ہیں۔ میری طویل عمر کا راز سادہ غذا اور فکر فاقے سے آزاد سادہ زندگی گزارنے میں پوشیدہ ہے۔

سب سے اچھا کام

مہیب ظفر انوار حمیدی

ثوبیہ صبح سے خاموش تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ سب سے اچھا کام کون سا ہے اور اسے کس وقت انجام دینا چاہیے؟

اس سلسلے میں اس نے اپنی امی سے معلوم کیا اور پوچھا "امی جان! سب سے اچھا کام کون سا ہوتا ہے؟"

امی جان مسکرائیں اور کہنے لگیں "بیٹی! سب سے اچھا کام تو سچ بولنا ہوتا ہے۔ جو بچہ جھوٹ نہیں بولتا وہ کوئی بھی غلط کام نہیں کرتا۔ اس لیے جو بچہ سب سے اچھا کام کرنا چاہے اس کو چاہیے کہ ہمیشہ سچ بولے' کبھی جھوٹ نہ بولے۔"

اتنا کہہ کر امی جان خاموش ہو گئیں۔

ثوبیہ کو امی کی بات بہت پسند آئی۔ اس نے دل ہی دل میں پکا ارادہ کر لیا کہ آئندہ کبھی جھوٹ نہیں بولے گی۔ اگر جھوٹ بولنا بھی پڑا تو صاف صاف کہہ دے گی کہ بھئی ہم تو جھوٹ بول رہے ہیں۔ ایسا سوچتے ہوئے خود ثوبیہ کو ہنسی آگئی کہ بھلا کیسا لگے گا جب وہ بتلائے گی کہ میں تو جھوٹ بول رہی ہوں۔

اگلے دن وہ اسکول پہنچی۔ پہلا پیریڈ مس افشاں کا تھا جو اپنی سخت گیری کی وجہ سے پورے اسکول میں مشہور تھیں۔ انہوں نے کلاس روم (کمرہ جماعت) میں آتے ہی تمام بچوں سے کہا کہ: میرے مضمون کی کاپیاں نکال لیں۔ وہ پڑھاتی بھی ریاضی تھیں اور اس مضمون سے ثوبیہ کو خدا واسطے کا بیر تھا۔ اکثر اسے کچھ سمجھ نہ آتا تو وہ پریشان ہو جاتی' روتی تو ابو سے ڈانٹ پڑتی کہ آخر ٹیوشن لینے کے باوجود تم ریاضی میں اتنی کمزور کیوں ہو۔ ثوبیہ روتی "ہائے ہائے — میرے اتنی موٹی عینک لگ جائے گی' بالکل بی جمالو لگوں گی' یہ مضمون میری جان لے لے گا۔ اللہ! کیا مصیبت ہے؟"

امی اور ابو سے خوب ملامتیں پڑا کرتیں۔ مگر کیا کرتی' پاس تو ہونا ہی تھا۔

مس افشاں نے جب اسے اپنے ہی خیالات میں کھوئے ہوئے دیکھا تو ناراض ہو کر اس سے بولیں "کیا بات ہے تم نے میری بات نہیں سنی؟"

"جی — جی' جی ہاں — وہ مس — بات یہ ہے کہ کل ہمارے ہاں مہمان آگئے تھے اور میں آپ کا کام بالکل نہیں کر سکی۔ سوری مس!"۔

اس نے کچھ ایسی عاجزی سے کہا کہ مس افشاں چند لمحے اس کی شکل دیکھتی رہیں۔ ادھر ثوبیہ کے کانوں میں مسلسل اپنی امی کا ایک ہی جملہ گونج رہا تھا کہ "بیٹی' سب سے اچھا کام جھوٹ نہ

بولنا ہے' اور..... وہ تو جھوٹ بول چکی تھی۔ دادی جان کہا کرتی تھیں: جھوٹے کے منہ سے بدبو آتی ہے' کوئی بھی جھوٹے آدمی کو پسند نہیں کرتا۔

ثوبیہ سخت شرمندہ تھی کہ وہ وعدے کے خلاف جھوٹ بول چکی ہے۔ لیکن مس افشاں نے نرم لہجے میں کہا "کوئی بات نہیں بیٹا..... لڑکیوں کو تو اپنی امی کا ہاتھ بٹانا ہی چاہیے' تم نے اچھا کیا کہ مہمانوں کی آمد پر اپنی امی جان کا ہاتھ بٹایا اور ان کا کام ہلکا اور آسان کر دیا۔ کوئی بات نہیں' تم آدھے وقفے میں ہوم ورک کر کے مجھے دکھلا دینا۔ کوئی بات نہیں!"

ساری لڑکیاں ثوبیہ کو حسرت سے دیکھنے لگیں۔ سب سوچ رہی تھیں کہ ثوبیہ کو اب سزا ملے گی۔ مگر یہاں تو سب کچھ الٹا ہو گیا تھا۔ ثوبیہ بھی تھوڑی دیر میں بات بھول بھال گئی۔

اُسے بھی نہ جانے کیوں یقین سا آنے لگا کہ جھوٹ بولنے سے کچھ نہیں ہوتا اور اللہ میاں بھی بچوں کو جھوٹ بولنے پر معاف کر دیتے ہیں۔ اس نے اپنی سہیلی رانی سے پوچھا: "رانی! میرے منہ سے بدبو تو نہیں آ رہی؟"

رانی نے اپنی ناک اس کے منہ کے قریب کرتے ہوئے کہا "آ آ کرو!"

ثوبیہ نے جھٹ سے منہ کھول دیا۔ رانی نے اچھی طرح سے سونگھا اور کہا "کوئی خاص بو تو نہیں آ رہی البتہ تمہارے دانت بہت پیلے پیلے ہو رہے ہیں"۔

"کیا کروں..... ٹی وی پر اشتہار دیکھ کر امی جان نے اس مہینے کوئی اور ہی ٹوتھ پیسٹ منگوایا۔ کم بخت کیسا ہے' نجانے دانت ہی صاف نہیں کرتا!" ثوبیہ روہانسی ہو گئی۔

مس افشاں نے دونوں کو باتیں کرتا دیکھ کر ڈانٹ دیا: "کیپ کوائٹ!"

"پاجامہ ڈھیلا..... قمیص ٹائٹ۔ کیپ کوائٹ! کھی کھی کھی!" رانی نے آہستہ سے کہا۔ آس پاس کی ساری لڑکیاں ہنسنے لگیں۔ لیکن مس افشاں کے خوف سے کسی نے بھی اپنی آواز بلند نہیں کی۔

پیریڈ ختم ہوتے ہی ہاف ٹائم کی گھنٹی بج گئی۔ تمام لڑکیاں ہنستی' اچھلتی' کودتی کلاسوں سے باہر نکلنے لگیں۔ رانی اور ثوبیہ چاٹ کے ٹھیلے پر جا پہنچیں۔

"بھیل پوری ہے انکل؟" رانی نے پوچھا۔

"نہیں بیٹا' سادہ چاٹ ہے' بولو آج مسالا ہلکا رکھوں یا تیکھا؟" چچا میاں مسکرا کر بولے۔

"یہ تیکھا کیا ہوتا ہے انکل؟" ثوبیہ نے سوال کیا۔

"اوہ..... ارے..... اُف..... یہ کیا ہے؟" ٹھیلے والے اور رانی نے اپنی اپنی ناکوں پر ہاتھ رکھ لیے۔ ثوبیہ کے منہ سے انتہائی گندی بدبو کا بھبکا نکلا تھا۔

"آہ!" ثوبیہ نے شرمندگی اور تکلیف کے مارے دونوں ہاتھ منہ پر رکھ لیے اور تیزی سے کلاس کی جانب دوڑ لگا دی۔ رانی اسے پکارتی ہی رہ گئی لیکن وہ کہاں رکتی۔ کلاس میں پہنچ کر اسے یوں لگا جیسے اس کے منہ کی بدبو بڑھتی ہی جا رہی ہے۔

"یا اللہ میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟ چھٹی میں تو ابھی دیر ہے"۔ وہ سخت پریشان تھی۔

وقفہ ختم ہوتے ہی لڑکیاں کلاس میں آنے لگیں لیکن کلاس روم میں تو ثوبیہ کے منہ سے نکلنے والی بدبو پھیلی ہوئی تھی۔

"اوں ہوں..... یہ کیسی بدبو ہے' بالکل سڑی ہوئی' یہ بدبو کہاں سے آرہی ہے؟" ہر کوئی پوچھنے لگا تھا۔

آناً فاناً بات مس اور مس سے میڈم تک پہنچ گئی۔ میڈم نے اسکول کے ڈاکٹر کو بلا لیا۔ ڈاکٹر صاحب نے منہ کھولنے کے لیے کہا۔ جیسے ہی اس نے منہ کھولا کئی لڑکیوں کو قے آگئی۔ خود ڈاکٹر صاحب اور میڈم نے اپنی اپنی ناکوں پر ہاتھ رکھ لیے۔

"یا میرے اللہ..... کتنی گندی اور غلیظ بدبو ہے"۔ میڈم نے کہا۔

"لگتا ہے یہ لڑکی برسوں دانت صاف نہیں کرتی اور اب تو اس کے مسوڑوں کا آپریشن ہو گا!" ڈاکٹر صاحب نے ناک پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

اب تو ثوبیہ کو سچ مچ رونا آگیا: "امی..... پیاری امی'..... مجھے معاف کر دیں امی! میں نے جھوٹ بولا ہے جس کی وجہ سے میرے منہ سے ایسی گندی بدبو آرہی ہے۔ اللہ میاں مجھے معاف کر دیں۔ اب میں آئندہ جھوٹ نہیں بولوں گی' میں سب سے اچھا کام کروں گی' میں جھوٹ نہیں بولوں گی۔ مس! مجھے معاف کر دیں میں آئندہ جھوٹ نہیں بولوں گی' میں نے جھوٹ بولا تھا کہ ہمارے ہاں مہمان آگئے تھے۔ مجھے معاف کر دیجئے' میں جھوٹ نہیں بولوں گی کیونکہ میرے منہ سے جھوٹ بولنے کی وجہ سے اتنی گندی بدبو آرہی ہے"۔

تمام استانیاں' لڑکیاں اور ڈاکٹر صاحب بالکل خاموش کھڑے تھے۔ اس خاموشی کو ڈاکٹر صاحب نے توڑا۔

"کچھ بھی ہو۔ اب تو سانپ نکل جانے کے بعد لکیر پیٹنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اب تو ثوبیہ کی زبان کا آپریشن ہو گا کیونکہ جھوٹ بولنے کی وجہ سے پوری زبان میں زخم پڑ گئے ہیں۔ اگر زبان نہ کاٹی گئی تو پورا منہ سڑ جائے گا اور ثوبیہ ساری زندگی کچھ نہ کھا پی سکے گی"۔

"آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں ڈاکٹر صاحب! آپ ثوبیہ کو آپریشن کے لیے لے کر چلیں' میں ان کے گھر فون کر کے ان کی امی سے آپریشن کی اجازت لے لیتی ہوں"۔ اتنا کہہ کر میڈم اپنے آفس کی جانب بڑھ گئیں اور ڈاکٹر صاحب نے اسکول کی ماسی سکینہ سے کہا کہ ثوبیہ کو کھینچ کر آپریشن کے لیے ہسپتال لے کر چلو۔ سکینہ آگے بڑھی اور..... ادھر ثوبیہ نے زور زور سے رونا شروع کر دیا۔

اب وہ آپریشن کی ٹیبل پر لیٹی زار و قطار رو رہی تھی اور اللہ پاک سے اپنے بچ جانے کی دعائیں مانگ رہی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک چاقو آگ پر خوب اچھی طرح سے گرم کیا اور ثوبیہ سے کہا کہ منہ کھولو۔ ثوبیہ نے کہا "اللہ'..... مجھے معاف کر دیں ڈاکٹر صاحب..... مجھے معاف کر دیں اللہ میاں' میں سچے دل سے وعدہ کرتی ہوں کہ آئندہ جھوٹ نہیں بولوں گی..... یا اللہ' یا اللہ....."

"ارے..... ارے کیا ہو گیا..... کیا ہو گیا بیٹی' یہ تم زار و قطار کیوں رو رہی ہو۔ کون سا جھوٹ بول دیا ہے تم نے؟ ارے ثوبیہ کی ماں ادھر تو آؤ' دیکھو یہ کیا کہہ رہی ہے؟ خواب میں ڈر گئی ہے شاید' اسی لیے منع کرتی ہوں کہ مغرب تک پڑی نہ سوتی رہا کرو۔ نماز پڑھا کرو بچی میرے ساتھ!"

دادی جان کی پیار بھری آواز ثوبیہ کے کانوں میں پڑی تو اس نے اللہ کریم کا لاکھوں بار دل ہی دل میں شکریہ ادا کیا کہ یہ ایک خواب تھا۔ ایسا خواب جس نے یقیناً اس کی زندگی بدل دی تھی۔

☆☆☆☆☆

مجیب ظفر انوار حمیدی

ادبی حلقوں کا معتبر نام۔ کئی کتابوں کے انعام یافتہ مصنف۔ سالہا سال سے "بچوں کے ادب" کی ترویج و ترقی کے لیے کام کر رہے ہیں۔ اپنی علمی' ادبی اور تدریسی خدمات کے حوالے سے متعدد اعزازات حاصل کر چکے ہیں۔ آج کل کراچی میں بچوں کے ادب پر پی ایچ ڈی کر رہے ہیں۔

عقل مند وہ ہے جو دوسروں کی غلطیوں کو بھول جائے اور اپنی غلطیوں کو ہمیشہ یاد رکھے!

میرا پیغام پیارے بچوں کے نام

بہت پیارے پاکستان کے نونہالو،
اور سب بزرگوں کی آنکھوں کے تارو پاکستانی بچو!

"تعلیم و تربیت" وہ خوبصورت اور فائدہ پہنچانے والا ادبی رسالہ ہے۔ میں اسے اپنی کم عمری کے زمانے سے پڑھتی رہی ہوں۔

میرے بچو! اگر آپ سب لوگ بلکہ پاکستان کے سارے لوگ جو مجھے ایک پڑھا لکھا انسان یا عورت سمجھ کر میری عزت کرتے ہیں اس محبت اور عزت میں میگزین "تعلیم و تربیت" کو پڑھنے کی عادت اور سعادت بھی شامل ہے۔ میری دعا ہے کہ پاکستان کے چاند ستارے ہمارے بچے "تعلیم و تربیت" کو پڑھیں اور اپنے دوستوں میں اس میگزین کو پڑھنے کا شوق پیدا کریں بلکہ اسکولوں میں اپنے پرنسپل حضرات یا خواتین سے درخواست کریں کہ وہ اضافی مطالعے کے طور پر "تعلیم و تربیت" کے رسالے لائبریری میں رکھا کریں۔ اللہ کا حکم ہے اچھا انسان اور اچھا مسلمان بننے کے لیے پڑھو سمجھو۔ قرآن کی آیت کہہ رہی ہے: "اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ"

(فاطمہ ثریا بجیا)

FATIMA SURAIYA BAJIA
Advisor to Chief Minister
Sindh

ضدّی

سیدہ انجم

"ابے او کلوّ کے بچے، آج تُو میرے ہاتھوں مارا جائے گا"۔ نواز کی یہ بے ہنگم چیخ و پکار سن کر بازار میں ایک مجمع اکٹھا ہو گیا۔ اردگرد کے دکاندار کھڑے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ مگر ان میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں تھا جو اس جھگڑے کو ختم کرواتا۔ ادھر نواز کی آنکھوں میں غصہ دیکھ کر لگتا تھا کہ آج کلوّ نواز کے ہاتھوں واقعی مارا جائے گا۔ نواز نے ایک ہاتھ سے کلو کا گریباں پکڑ رکھا تھا اور دوسرے ہاتھ سے وہ اس کی پٹائی کر رہا تھا۔

چاچا کو غصہ بھی تو پورے ایک ہفتے سے تھا۔ اس کی عمر کوئی 60 سال کی تھی۔ وہ اس بازار میں پھلوں کا ٹھیلہ لگایا کرتا تھا۔ کلو بھی اسی محلے کا تھا جس محلے کا نواز رہنے والا تھا۔ کلو کی عمر 10 سال تھی۔ وہ اکلوتا ہونے کی وجہ سے انتہائی بدتمیز ہو چکا تھا۔ ایک ہفتے سے کلوّ نواز کے ٹھیلے کے ٹائر کی ہوا نکال دیتا تھا۔ چاچا نواز کو بھی دن بھر پتا نہ چلتا۔ جب وہ گھر جانے کے لیے ٹھیلا موڑتا تب اسے خبر ہوتی۔ چاچا بے چارہ خود رو دھو کر چپ ہو جاتا۔ اس حرکت کی وجہ سے چاچا نواز کو بڑی تکلیف ہوتی۔ لیکن کلوّ کو اس سے کیا غرض! اسے تو چاچا کی اس بے بسی پر مزہ آتا تھا۔ لیکن وہ کہتے ہیں نا کہ بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔ چنانچہ کلوّ حسبِ معمول اپنے ساتھیوں کے ہمراہ چاچا نواز کے ٹھیلے پر پہنچ کر ٹائر کی ہوا نکال ہی رہا تھا کہ چاچا غصے میں بھرا موقعے پر پہنچ گیا۔ اس نے کلوّ کی پشت پر زور سے گھونسا مارا۔ کلوّ کو اس کارروائی کی توقع نہ تھی۔ اب چاچا تھا اور کلوّ۔ اس کے سارے ساتھی موقعہ دیکھ کر بھاگ گئے تھے۔ نواز اب کلوّ کی خوب خاطر تواضع کر رہا تھا۔

"ارے میں تجھے جندہ (زندہ) دفن کر دوں گا!"۔ اسی مجمع سے اچانک ایک آواز نواز کے کانوں سے ٹکرائی "نواز، آخر ایسا کیا ہو گیا ہے جو تم اس بچے کو مار رہے ہو؟"۔ یہ جیلانی صاحب تھے۔ جیلانی صاحب اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے اور نواز کے پرانے گاہک۔

انہیں دیکھ کر نواز نے کہا "صاحب جی' اسے بچہ نہ کہیں یہ تو بدمعاش ہے' بدمعاش۔ ارے میں بھی سوچوں کہ یہ روج روج کون ہووے ہے میرے ٹھیلے کے ٹائر کی ہوا نکالنے والا۔ آج میں نے اسے پکڑ لیا ہے۔ اب یہ یہاں سے سیدھا تھانے جائے گا"۔ نواز کے منہ سے تھانے کا نام سن کر کلو کے تو ہوش اڑ گئے۔ اس نے سن رکھا تھا کہ تھانے میں بہت مارتے ہیں۔ یہ سوچ کر کلو نرم پڑ گیا اور نواز سے کہنے لگا "چاچا' اب کی بار معاف کر دو! میں وعدہ کرتا ہوں آئندہ ایسا ہرگز نہیں کروں گا"۔ کلو نواز کی منت سماجت کرنے لگا۔ مجمع اب چھٹ چکا تھا۔ مگر نواز کا غصہ بدستور ویسا ہی تھا۔ کلو ابھی تک نواز کی گرفت میں تھا۔ جیلانی صاحب پھر بولے "نواز چھوڑ دو اس بچے کو"۔ "صاحب جی! آپ اس بچے کو نہ جانے ہیں۔ یہ یہاں روج آکر بدمعاشی کرے ہے"۔ نواز نے غضب ناک نظروں سے کلو کو دیکھتے ہوئے کہا۔ کلو کا منہ مار کھانے کی وجہ سے سوج چکا تھا۔ قمیض کے سارے بٹن ٹوٹ گئے تھے اور دانتوں سے خون نکل رہا تھا۔ پاؤں کی چپل غائب ہو چکی تھی۔ کلو کے ساتھی اسے اکیلا چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ اب جیلانی صاحب نواز کو چھوڑ کر کلو سے مخاطب ہوئے: "کیا نام ہے تمہارا؟" "کلو" کلو نے اپنے جھکے ہوئے سر کو مزید جھکاتے ہوئے جواب دیا۔ "کلو' یہ تو کوئی نام نہ ہوا؟ اصلی نام بتاؤ نا"۔ "کلیم احمد" کلو نے جواب دیا۔ "پڑھتے ہو؟"

"جی!"۔ کون سی جماعت میں؟" "تیسری میں!" "تو تم نے آج چھٹی کی ہے یا اسکول جاتے ہی نہیں ہو؟" جیلانی صاحب نے پھر پوچھا۔ ابھی کلو کچھ کہنے کے لیے جواب تلاش کر ہی رہا تھا کہ نواز بیچ میں بول پڑا "صاحب جی! آپ بھی بھولے بادشاہ ہیں۔ یہاں کے بچے اسکول میں کہاں ملیں گے؟"۔ جیلانی صاحب نے نواز کی باتوں کا کوئی جواب نہ دیا۔ اب وہ کلو کے اور قریب آگئے اور اس کے بالوں کو درست کرتے ہوئے کہنے لگے "شاید اسکول میں تمہارا دل نہیں لگتا۔ کیونکہ وہاں تم مار کھاتے ہو" جیلانی صاحب نے تو جیسے کلو کی دل کی بات کہہ دی ہو۔ وہ دل میں سوچنے لگا: ان کو کیسے پتا چلا۔ پھر وہ بولے "بیٹا! میں نے ایک عمر گزاری ہے اسکولوں میں' تم مار کھانے والا کام کیوں کرتے ہو؟ اس لیے کہ تمہیں اس میں مزہ آتا ہے۔ دوسروں کو تکلیف دینا اچھی بات نہیں ہے اور پھر ہم تو مسلمان ہیں بیٹا! جن کے نبی ﷺ نے فرمایا ہے کہ "خدا کی قسم وہ مسلمان نہیں ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسروں کو تکلیف پہنچے" تم نے یہ کبھی نہ سوچا ہو گا کہ چاچا بھی تو تمہارے والد جیسا ہے اور کوئی تمہارے ابا کو ایسا تنگ کرے تو تمہیں کیسا لگے گا؟ یقیناً برا بلکہ بہت برا' لیکن تم نے ایسا نہیں سوچا۔ اس لیے تم یہ غلط کام کرتے رہے۔ اب تو تمہیں پتا چل گیا ہے نا! اب نہ کرنا ایسا کام۔ ٹھیک ہے میرے بیٹے!"۔ جیلانی صاحب نے یہ کہتے ہوئے اس کے کندھے کو پیار سے سہلایا۔

کلو خاموش کھڑا ٹپ ٹپ آنسو بہا رہا تھا۔ اس سے پہلے تو آج تک کسی نے اس کو اس طرح نہیں سمجھایا تھا۔ جیلانی صاحب نواز سے مخاطب ہوئے "نواز' اسے چھوڑ دو! اب مجھے یقین ہے کہ یہ دوبارہ ایسے کام نہیں کرے گا ان شاء اللہ!"

ٹھیک ہے صاحب جی! میں آپ کے کہنے پر چھوڑ دیتا ہوں' پر اب اس نے ایسا کیا تو تھانے بھجوا دوں گا"۔ نواز اب کچھ نرم پڑ گیا تھا۔ کلو خود کو نواز کی گرفت سے آزاد پا کر ایسا بھاگا کہ گھر پہنچ کر ہی دم لیا۔ ادھر کلو کا یہ حلیہ دیکھ کر اس کی اماں بہت پریشان ہوئیں۔ اگرچہ وہ اس کی حرکتوں سے واقف تھیں مگر آج کلو کو دیکھ کر انہیں اندازہ ہو گیا کہ آج وہ گرفت میں آگیا ہے۔

کلیم کا حال بھی بہت برا تھا۔ وہ گم صم بیٹھا تھا۔ اب اماں جی کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر اس کا دل بھر آیا۔ اس نے پیار سے اماں جی کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کہنے لگا "اماں! اب میں آپ کو تنگ نہیں کروں گا۔ سارا قصور میرا ہے۔ چاچا بھی تو میرے ابا جیسا ہے۔ اب میں کسی کو تنگ نہیں کروں گا۔ اللہ تعالیٰ ناراض ہوتے ہیں نا!"۔ اماں جی کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے اندھیرے میں ایک دم سے روشنی ہو گئی ہو۔ اب ان کو پورا یقین تھا کہ کلیم کبھی ایسا نہیں کرے گا کیونکہ جب وہ کسی چیز کا عزم کر لیتا تو پھر اس پر قائم رہتا ہے۔ اس بار اس کی ضد نیک مقصد کے لیے تھی۔

☆☆☆

برے سلوک کا بہترین جواب اچھا سلوک ہے!

سمندر میں بکھرے ہوئے جزیروں کے سپر اسٹار جی ہاں! یہ بات ویسٹ انڈیز ٹیم پر صادر ہوتی ہے۔

دنیائے کرکٹ میں جس طرح آسٹریلیا کی ٹیم "کنگروز" اور نیوزی لینڈ کی ٹیم "کیویز" کے نام سے مشہور ہے اسی طرح ویسٹ انڈیز کی ٹیم مقامی زبان میں ونڈیز (Windies) کہلاتی ہے۔ پاکستان کی قومی کرکٹ ٹیم آج کل ویسٹ انڈیز کے دورے پر ہے اور غالباً جس وقت یہ شمارہ آپ کے ہاتھ میں ہوگا' قومی ٹیم دوسرے ٹیسٹ میچ میں مصروف ہوگی۔ ویسٹ انڈیز جسے دنیا جزائر غرب الہند کے نام سے جانتی ہے دراصل شمالی اور جنوبی امریکا کے درمیان بحیرہ کریبین کے وسیع و عریض ہزاروں میل کے رقبے پر پھیلے ہوئے سینکڑوں چھوٹے چھوٹے جزائر پر مشتمل ملکوں کا نام ہے۔ ان جزیروں کے درمیان طویل سمندری فاصلے ہیں لیکن کرکٹ کے کھیل نے ان فاصلوں کو سمیٹ دیا ہے اور ان مختلف جزائر کے کھلاڑیوں پر مشتمل ٹیم کو ہم ویسٹ انڈیز کرکٹ ٹیم سے پہچانتے ہیں۔ ان جزائر میں سینٹ لوئیسا گرینڈا جمیکا' بارباڈوس' ٹیرنی ڈاڈ' ٹوبیگو' اینٹیگا خاصے مشہور ہیں۔ ان کے علاوہ چھوٹے چھوٹے سینکڑوں جزائر اور بھی ہیں۔ کرکٹ کو یہاں قومی کھیل کا درجہ حاصل ہے اور جزائر کے باشندے کرکٹ کو ہی اوڑھنا بچھونا سمجھتے ہیں۔

تاریخی حوالوں سے جزائر غرب الہند میں کرکٹ کا اولین میچ 12 مئی 1806ء کے دن سینٹ این کرکٹ کلب جزیرہ باربڈوس میں کھیلا گیا۔ بعد میں 1840ء میں برٹش گیانا اور جزیرہ ٹرینیڈاڈ میں بھی کرکٹ کا کھیل متعارف ہوا لیکن مشہورِ زمانہ کرکٹ کلب کنگسٹن کرکٹ کلب کی بنیاد 1843ء میں جمیکا میں رکھی گئی۔ بعدازاں تقریباً 14 سال بعد ایک اور مشہور کلب جارج ٹاؤن کرکٹ کلب گیانا بھی وجود میں آیا۔

جزائر غرب الہند میں کرکٹ کو متعارف کرانے کا سہرہ انگریزوں کے سر ہے جنہوں نے ان جزیروں پر نو آبادیاتی نظام کے تحت حکومتیں کیں۔ انگریزوں نے جس وقت کرکٹ شروع کی تو مقامی سیاہ فام باشندوں کو اس کھیل سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی بلکہ وہ صرف گوروں کو کھیلتے ہوئے دیکھتے یا پھر ان کی خدمت گزاری کرتے۔ لیکن آنے والے وقت میں اس مفتوح قوم نے کرکٹ میں وہ مہارت حاصل کر لی کہ کرکٹ کی سپر پاور کہلائے اور اس کھیل پر گوروں کی اجارہ داری بھی ختم کر دی۔

ویسٹ انڈیز کی سرزمین پر کھیلے جانے والی ٹیسٹ سیریز کو دورے پر آنے والی ٹیم ہمیشہ سے انتہائی دشوار اور مشکل تصور کرتی ہے جس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اپنی سرزمین پر سیاہ فام کھلاڑی مخالف ٹیم کے لیے سخت مشکلات پیدا کرتے ہیں۔ ان کے برق رفتار طوفانی باؤلرز دھواں دار سٹروک میکر بلے باز' جنونی تماشائی اور محبِ وطن ایمپائرز کی موجودگی میں مہمان ٹیم کے لیے کامیاب ہونا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ لیکن اس کے باوجود ویسٹ انڈیز ٹیم ایک جانباز ٹیم مانی جاتی ہے۔ چاہے وہ اپنی سرزمین پر یا غیر ملک میں کھیل رہی ہو' ان کی کارکردگی کا معیار ہمیشہ یکساں ہوتا ہے۔ دراصل کرکٹ کے ہر شعبے میں خواہ گیند بازی ہو بلے بازی ہو یا پھر فیلڈنگ' وہ قابل ستائش کارکردگی کا مظاہرہ کرتی ہے۔ جس

طرح پچھلی دہائیوں میں پاکستانی 2 ڈبلیوز یعنی وسیم اور وقار کی جوڑی نے دنیائے کرکٹ میں تہلکہ مچا رکھا تھا اسی طرح ویسٹ انڈیز کے 3 ڈبلیوز وارل' ویکس' والکوٹ نے اپنے کھیل میں وہ وہ کارنامے دکھائے جن کی صدا آج تک کرکٹ کے حلقوں میں سنی جا سکتی ہے۔ 3 ڈبلیوز میں سر فرینک وارل پہلے سیاہ فام کھلاڑی تھے جنہوں نے مختلف جزائر سے کھلاڑی چن کر ایک لڑی میں پرو دیئے اور ایک ایسی ٹیم تشکیل دی جس نے ویسٹ انڈیز کو دنیائے کرکٹ میں منفرد مقام دلوایا۔ ان کی ولولہ انگیز قیادت نے ٹیم میں بے جگری سے لڑنے کی روح پھونک دی۔ تاہم قیادت کے اصل بے تاج بادشاہ کلایو لائیڈ (CLIVE LLYOD) جن کی کپتانی میں ٹیم نے بے پناہ کامیابیاں حاصل کیں اور ویسٹ انڈیز کو کرکٹ کی سپر پاور ہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔ انہوں نے ٹیسٹ کرکٹ میں مسلسل گیارہ ٹیسٹ میں فتوحات کا ریکارڈ بھی قائم کیا۔ 36 ٹیسٹ جیتے جن میں دو بار کرکٹ عالمی کپ 1975' 1979 بھی حاصل کئے۔ بلے بازوں کی فہرست میں کنگ رچرڈ کا ذکر نہ کرنا سخت ناانصافی ہو گی جسے آج بھی دنیائے کرکٹ کا سب سے جارح مزاج سٹروک میکر مانا جاتا ہے۔ بقول ویون رچرڈ وہ آج تک کسی بھی باؤلر سے مرعوب نہیں ہوا لیکن اندر سے وہ مشہور زمانہ پاکستانی آف سپنر نذیر جونیئر کا سامنا کرتے ہوئے خائف رہتا تھا۔ نذیر جونیئر نے متعدد بار اسے کلین بولڈ کیا۔

موجودہ کھلاڑیوں میں برائن لارا دنیائے کرکٹ کا عظیم بلے باز مانا جاتا ہے۔ اس کے پاس سب سے زیادہ 400 رنز ناٹ آؤٹ رہنے کا عالمی ریکارڈ ہے جو اس نے اپریل 2004ء میں سینٹ جان کے مقام پر بنایا تھا۔ اس کے علاوہ ویسٹ انڈیز میں دو اور ایسے کھلاڑی گارفیلڈ سوبرز اور لارنس رو (ROWE) بھی ہیں جنہوں نے تین سنچریاں اسکور کرنے کا اعزاز دو دفعہ حاصل کیا۔ علاوہ ازیں سر ڈونلڈ بریڈ مین (آسٹریلیا) بھی ایسے کھلاڑی ہیں جنہوں نے 300 رنز سے زائد اسکور دو دفعہ کیا۔ تیز رفتار باؤلنگ کے شعبے میں کرونی والش سرفہرست ہیں جنہوں نے اولین 500 سے زائد وکٹ لینے کا عالمی ریکارڈ بنایا۔ ٹیسٹ کرکٹ میں ان کے علاوہ کرٹلی ایمبروز' مرحوم میلکم مارشل' مائیکل ہولڈنگ اور اینڈی رابرٹ کی اپنی منفرد پہچان تھی۔

پاکستان نے ویسٹ انڈیز کا پہلا سرکاری دورہ 1958ء عبدالحفیظ کاردار کی قیادت میں کیا تھا۔ پہلے ٹسٹ کی دوسری اننگ میں لٹل ماسٹر حنیف محمد نے 337 رنز کی ریکارڈ ساز اننگ کھیل کر دنیا کو حیرت زدہ کر دیا اور وکٹ پر طویل دورانیے تک ٹھہرنے کا یہ ریکارڈ آج تک قائم ہے۔ پاکستان نے دوسری اننگ میں 658/8 کھلاڑی آؤٹ پر پہاڑ جیسا ٹوٹل اسکور کیا۔ دیکھئے' اس دفعہ انضمام الحق کی زیر قیادت پاکستان کارکردگی کا کیسا مظاہرہ کرتا ہے!

ویسٹ انڈیز کی ٹیم نے ایک طویل عرصے تک کرکٹ کے میدانوں پر حکمرانی کی اور تقریباً 15 سال تک ٹسٹ سیریز میں ناقابل شکست رہے۔ لیکن اب پچھلے چند سالوں سے ویسٹ انڈیز ٹیم کی کارکردگی تنزلی کا شکار ہے اور اس وقت عالمی درجہ بندی روبہ زوال ہے۔ شنید ہے کہ وہاں باسکٹ بال کا کھیل زیادہ مقبولیت حاصل کر رہا ہے۔ اس وقت عالمی کرکٹ کے نقشے پر آسٹریلیا سرفہرست ہے جب کہ پاکستان کا بھی اوپر کے درجوں میں شمار ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ پاکستان کو کامیابی و کامرانی عطا فرمائے (آمین)

(یہ مضمون ویسٹ انڈیز کے موجودہ دورے کے آغاز میں لکھا گیا)

سب سے پہلے تو سالگرہ نمبر نکالنے پر پیشگی مبارک باد قبول کیجیے۔ اس دفعہ "تعلیم و تربیت" اپنی مثال آپ تھا۔ خاص کر جنید احمد کی کہانی "شیطانی مینار" نے تو دل ہی جیت لیا۔ کہانیاں "محبت" اور "سیلاب" بے حد پسند آئیں۔ ارے چچا حیرت کو کون بھول سکتا ہے؟ چچا حیرت کی شاعری کے کیا کہنے! اللہ تعالیٰ "تعلیم و تربیت" کو ہمیشہ چمکتا دمکتا رکھے۔ آمین۔

(شبیر ثاقب اسلام آباد)

مئی کا شمارہ ہاتھوں میں ہے۔ بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ درس قرآن کے علاوہ نعت بھی لاجواب تھی۔ یوم مئی کے حوالے سے نظم "محنت کی عظمت" بہت پسند آئی۔ اس کے علاوہ بابو کراچی والا اور بند مٹھی کھولوں! بھی خوب تحریریں تھیں۔ چچا حیرت کی شاعری بھی دلچسپ اور مزے دار رہی۔ اس کے علاوہ نادان کی دوستی' بہار کے دن اور اصل خزانہ بہترین تحریریں ہیں۔ خدا "تعلیم و تربیت" کو مزید ترقی عطا کرے۔ (آمین)

(ظفر اقبال بھٹی' کہوٹہ)

انکل جی کیا خطا کی ہے ہم نے! ہم تو بہت پیار و محبت سے خط لکھتے ہیں۔ لیکن آپ کی ظالم بلکہ ظالموں سے بڑھ کر ظالم ردی کی ٹوکری' ہمارے پیارے معصوم خط ہڑپ کر جاتی ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اس کا معدہ بھی خراب نہیں ہوتا۔ چلو کوئی بات نہیں کب تک ہمارے خطوط شائع نہیں کریں گے آپ۔ ہم بھی ہمت ہارنے والے نہیں ہیں۔ مئی کا شمارہ بہت پسند آیا اور ہمیشہ کی طرح اس بار بھی تمام تحریریں لاجواب تھیں۔ انکل! چچا حیرت کا دیدار ہر ماہ کرا دیا کریں۔ چچا حیرت کے بغیر ہمیں مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ تعلیم و تربیت "سالگرہ نمبر" کا بہت خوشی اور شدت سے انتظار ہے۔ (حافظ محمد عاصم' لاہور)

مئی کا شمارہ ملا۔ بہت اچھا تھا۔ کہانیاں' لطیفے' معلومات وغیرہ سب بہت اچھی تھیں۔ "آداب زندگی' سیرت نبویؐ کی روشنی میں بہت اچھا لگا اور چچا حیرت کی شاعری بھی بہت اچھی تھی۔ بہت سی معلومات بھی حاصل ہوئیں۔ میں جماعت نہم کا طالب علم ہوں اور چھٹی جماعت سے تعلیم و تربیت پڑھ رہا ہوں۔ ہمیں جون کے شمارے کا شدت سے انتظار ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے تعلیم و تربیت کو یونہی اچھا اور کامیاب رکھے۔

(سید قمر عباس اورکزئی)

آپ کا رسالہ ماشاء اللہ بہت ترقی پا رہا ہے۔ اس میں شامل ہر کہانی معیاری اور سبق آموز ہوتی ہے۔ مئی کے شمارے میں نذیر انبالوی کی کہانی "بابو کراچی والا" بہت پسند آئی۔ محمد ادریس قریشی کی "چچا حیرت کی شاعری" بھی بہت اچھی لگی۔ کہانی میں دیا گیا ای میل ایڈریس صحیح ہے یا نہیں۔

(قاریہ رومیصاء متین' سکھر)

☆ جی ہاں' چچا حیرت کا ای میل ایڈریس صحیح ہے۔ شمارہ آپ کو پسند آیا' اس کے لیے ہم شکر گزار ہیں۔

مئی کا شمارہ پڑھا' بے حد پسند آیا۔ اس دفعہ محبت' بند مٹھی کھولوں' نادان کی دوستی اور چچا حیرت کی شاعری کے علاوہ باقی کہانیاں بھی دلچسپ تھیں۔ سارا شمارہ ہر لحاظ سے زبردست تھا۔ خدا کرے تعلیم و تربیت اسی طرح ترقی کی منزلیں طے کرتا رہے (آمین)

(وقاص احمد میرپور آزاد کشمیر)

اس دفعہ تعلیم و تربیت بہت جلد مل گیا۔ ٹائٹل بہت خوبصورت تھا۔ سالنامے کی خوشخبری سن کر بہت خوشی ہوئی۔ نذیر انبالوی کی کہانی "بابو کراچی والا" نمبرون پر رہی۔ چچا حیرت کی شاعری پڑھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ سلسلے وار کہانی سیلاب بھی دلچسپ ہے۔ تعلیم و تربیت کے مستقل سلسلے درس قرآن' اچھے بچو پیارے بچو' ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند' شوخیاں ڈاٹ کام' حیران کن' آپ بھی لکھیے' آیئے مسکرائیں' داؤدی

علمی آزمائش' اوجھل خاکے اور کھوج لگایئے زبردست ہیں۔ بلال رازی کی نعت بہت اچھی تھی۔ طارق ریاض خان کی کہانی "محبت" نے رسالے کو چار چاند لگا دیئے۔ حامد مشہود کی کہانی بند مٹھی کھولوں نصیحت آموز کہانی تھی۔ نظمیں سبھی اچھی تھیں تاہم "محنت کی عظمت" سب سے اچھی تھی۔ جنید احمد کی کہانی شیطانی مینار بہت دلچسپ کہانی تھی۔

(عاصم' عثمان طارق' جہلم)

مجھے کیا' میرے پورے گھر والوں کو "تعلیم و تربیت" بہت پسند ہے۔ انکل! میں نے پہلے بھی بہت خط لکھے تھے لیکن شائع نہیں ہوئے۔ مجھے تو لگتا ہے آپ نے میرا خط شائع نہ کرنے کی قسم رکھی ہے۔

(فرقان طارق' راولپنڈی)

☆ بیٹے ناراض نہ ہوں' لیجئے آپ کا خط شائع ہو گیا!

مزدور ڈے کے حوالے سے مئی 2005ء کا شمارہ ملا۔ چچا حیرت کی شاعری' بابو کراچی والا اور بند مٹھی کھولوں! ساری تحریریں لاجواب تھیں۔ "محنت کی عظمت" نظم واقعی اچھی تھی۔ "اعتبار ساجد' کی نادان کی دوستی کہانی اچھی جا رہی ہے۔ اگر کسی شمارے میں علی اکمل تصور کا انٹرویو بمع تصویر شائع ہو تو میں "تعلیم و تربیت" کا بہت ممنون ہوں گا کیونکہ علی اکمل تصور میرے بیسٹ رائٹروں میں سے ایک ہیں۔

(اسد حسین اسد' رحیم یار خان)

میں "تعلیم و تربیت" کا کئی سال سے خاموش قاری ہوں۔ رسالہ بہت ہی اچھا جا رہا ہے۔ تقریباً سبھی سلسلے اچھے ہوتے ہیں۔ ہمارے تمام گھر والے آپ کا رسالہ بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔ اس دفعہ بلال رازی کی نعت بہت اچھی تھی۔ میری دعا ہے تعلیم و تربیت ہمیشہ یونہی کرتا رہے۔ آمین

(نام و مقام نامعلوم)

اس دفعہ سب کہانیاں بہت اچھی تھیں۔ چچا حیرت نے کمال کر دیا۔ ہمیں اس کا انتظار بہت رہتا ہے۔ میں پانچویں کلاس میں پڑھتی ہوں اور آپ کو یہ جان کر بہت خوشی ہو گی کہ میں ہر سال سالانہ ایگزام میں "اول" پوزیشن حاصل کرتی ہوں۔ آپ کو بہت مبارک ہو کیونکہ اس بار جون میں "تعلیم و تربیت" کی سالگرہ ہے۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ اس کو مزید ترقیاں دے۔ (آمین)

(ملیحہ تنویر' لاہور)

☆ مبارکباد کا شکریہ۔ اول پوزیشن لینے پر ہماری طرف سے بھی مبارکباد قبول کریں۔ ہم آپ کے لیے تہہ دل سے دعاگو ہیں۔

سویٹ انکل! مئی کا شمارہ بہت پسند آیا۔ خاص طور پر شیطانی مینار والی کہانی بہت دلچسپ تھی۔ باقی تمام کہانیاں بھی اچھی تھیں۔ میں نویں جماعت کی طالبہ ہوں اور آپ کا رسالہ بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ انکل میں آپ کو ایک خوشخبری تو بتانا ہی بھول گئی۔ میں نے آٹھویں جماعت میں اپنی پوری جماعت میں پہلی پوزیشن حاصل کی ہے۔

(فوزیہ اشرف' مقام نامعلوم)

☆ اعلیٰ کامیابی پر ہماری طرف سے مبارکباد قبول کریں۔

میں جماعت نہم کی طالبہ ہوں۔ میں نے کئی رسالے پڑھے ہیں لیکن ان میں مجھے سب سے زیادہ "تعلیم و تربیت" ہی پسند آیا۔ سب سے اچھی کہانی اس دفعہ "بند مٹھی کھولوں!" تھی۔ انکل آپ کا رسالہ اتنا اچھا ہے کہ میں اسے ایک ہی دن میں پڑھ لیتی ہوں۔ (سدرہ کمال' لاہور)

مئی کا شمارہ مہینہ شروع ہونے سے پہلے ہی مل گیا۔ سرورق سے لے کر بلاعنوان کارٹون تک سب اچھا لگا۔ اچھے بچو پیارے بچو بہت اچھا سلسلہ ہے۔ درس قرآن بھی لاجواب ہے۔ اس مرتبہ کہانیوں میں بابو کراچی والا' چچا حیرت کی شاعری' میں نے تمہیں معاف کیا' نمبر لے گئیں۔ محبت اور ٹیپو سلطان بھی اچھی بلکہ بہت اچھی رہیں۔ قسط وار سیلاب اچھی جا رہی ہے۔ دماغ لڑاؤ میں پہلے انعام پر جب اپنا نام دیکھا تو دل "گارڈن گارڈن" ہو گیا۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔ میرا تعلیم و تربیت میں یہ پہلا خط ہے' ضرور شائع کیجئے گا۔

(شمیلہ شاہد علوی' کراچی)

مئی کا شمارہ ملا۔ بے حد پسند آیا۔ چچا حیرت کی شاعری پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ اس کے علاوہ اعتبار ساجد کی کہانی "سیلاب" نمبرون جا رہی ہے۔ سرورق بہت خوبصورت تھا۔

(نازش افتخار' گجرات)

شوخیاں ڈاٹ کام

مروت

سید شوکت اعجاز

حیران کُن

سید شوکت اعجاز

صحرا کا سفر

مغربی افریقہ میں امرو قبیلے کے ایک گیارہ سالہ لڑکے نے اپنا "پیارا گدھا" صحراؤں کی ناقابلِ برداشت سختیاں جھیل کر ڈھونڈ نکالا۔ اس کے لیے اس نے دنیا کے سخت ترین' تپتے صحرا میں 1120 میل کا طویل سفر طے کیا۔

خوش نصیب ڈھولک باز!

8 ستمبر 1860ء کو مشی گن جھیل میں بحری جہاز "لیڈی ایلگن" غرق ہو گیا جس میں سوار 297 مسافر ڈوب گئے لیکن صرف ایک لڑکا چارلس جو ڈرم بجانے کا کام کرتا تھا' بچ گیا اور اپنے اسی ڈرم کی مدد سے تیرتا ہوا کنارے پر آگیا۔

حاکم کی علامت!

کانو' نائیجیریا میں بادشاہ اور ان کے خاندان کے لوگ شتر مرغ کے پروں سے بنائے گئے سلیپر (جوتے) پہنتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ ہاتھ میں ایک خاص قسم کا بھالا بھی پکڑے رکھتے ہیں جو قدیم وقتوں کے دو جڑواں بھائیوں کی نشانی سمجھا جاتا ہے۔

مافوق الفطرت پرندہ

یورپی پرندہ "کنگ البرٹ" کے دو لمبے سینگ ہوتے ہیں جو اس کے مجموعی جسمانی حجم سے بھی تین گنا بڑے ہوتے ہیں۔

آج سردار کے سامنے جانی کی پیشی تھی۔ جانی کا رنگ زرد تھا اور بدن میں کپکپی دوڑ رہی تھی..... آخر شیدے نے آکر اسے بتایا: "چلو..... سردار بلا رہا ہے"۔

شیدے کا لہجہ کافی سخت تھا..... عام طور پر اسے سردار کا جلاد کہا جاتا تھا۔ کسی کو بھی سزا دینا اس کا کام تھا۔ سردار کا تو بس حکم چلتا تھا..... وہ لڑکھڑاتے قدموں سے اس کے پیچھے چل پڑا۔ سردار اس وقت ہال کمرے میں تھا۔ اس کے سب ساتھی بھی وہیں تھے۔ وہ اندر داخل ہوا تو اور بری طرح کانپنے لگا..... سردار کا چہرہ مارے غصے کے سرخ تھا۔ آنکھیں باہر کو ابلی پڑ رہی تھیں۔

"الو کے پٹھے! رات تو پھر ناکام رہا' یہ تیری تیسری ناکامی ہے..... تمہارے راستے کی تمام رکاوٹیں تمہارے ساتھی دور کر چکے تھے..... پھر آخر تم سیٹھ خاور کی تجوری کیوں صاف نہیں کر سکے؟"۔

جواب میں وہ خاموش رہا۔

"جواب دو..... ورنہ شیدا حرکت میں آجائے گا"۔

"نن..... نہیں سردار' نہیں" وہ لرز گیا۔

"ارے تو پھر وضاحت کرو نا!" شیدا نفرت سے بولا۔

"میں..... میں..... میں" وہ اٹک اٹک گیا۔

"اوئے بکری کی اولاد..... سیدھی طرح بتا..... سیٹھ خاور کی تجوری کیوں صاف نہیں کی؟..... کہیں اس سے معاملہ تو طے نہیں کر لیا تھا!" سردار گرجا۔

"نہیں سردار! ایسی کوئی بات نہیں"۔

"تب پھر جیسی بات ہے' بتاؤ"۔

"وہ..... دراصل..... میں جب تجوری کے سامنے پہنچا..... وہاں سیٹھ خاور مصلّے بچھائے نماز پڑھ رہا تھا"۔

"تو پھر کیا ہوا..... اکثر لوگ تہجد کی نماز پڑھتے ہیں۔ اس میں عجیب بات کیا ہوئی؟..... تم پستول کا رخ اس کی طرف کرتے اور اپنا کام کر گزرتے"۔

"بس سردار..... نماز کی حالت میں میں اس کی طرف پستول نہ تان سکا اور واپس لوٹ آیا"۔

"دیکھو! یہ تمہاری آخری غلطی ہے..... اس کے بعد کوئی موقع نہیں ملے گا..... تم آج رات پھر سیٹھ خاور کے پاس جاؤ گے..... اگر تم آج بھی اس کی تجوری سے مال نکال کر نہ لائے تو شیدا تمہیں گولی مار دے گا"۔

"نن..... نہیں..... نہیں"۔

"شیدے' اس کی نگرانی کرو..... یہ کسی سے بھی رابطہ نہ کرنے پائے"۔

آپ فکر نہ کریں' سردار!"۔ شیدے نے دانت نکال دیئے۔

☆☆☆

رات کے ٹھیک تین بجے جانی پھر سیٹھ خاور کے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ سیدھا آگے بڑھتا چلا گیا..... اور پھر اسے ایک جھٹکا سا لگا..... سیٹھ خاور اس وقت بھی نماز کی حالت میں تھے ..... وہ کانپ گیا..... اچانک دروازے کی طرف مڑا اور اس کو اندر سے بند کر دیا۔ پھر پستول جیب سے نکال کر سیٹھ خاور کے سامنے رکھ دیا اور ایک طرف کھڑا انتظار کرنے لگا..... یہاں تک کہ سیٹھ خاور نے سلام پھیرا..... ان کے چہرے پر حیرت ہی حیرت تھی۔

"نوجوان! کون ہو تم؟"۔

"ایک چور..... لیکن میں اس زندگی سے بہت تنگ آچکا ہوں..... میں چوروں کے ایک گروہ میں شامل ہوں۔ سردار کا حکم ہے کہ میں آپ کی تجوری صاف کروں۔ میں کل بھی آیا تھا' لیکن آپ نماز

بچوں کے ادب میں دلچسپ' سبق آموز اور سنسنی خیز کہانیوں کی جب بھی بات ہو گی' معیار اور مقدار کے حوالے سے ممتاز ادیب جناب اشتیاق احمد کا نام ہمیشہ سرفہرست رہے گا۔ بچوں کے لیے لکھے گئے آپ کے ایک ہزار کے قریب ناول مقبولیت کے لحاظ سے قابل ذکر قرار دیئے جاتے ہیں۔ "تعلیم و تربیت" کے ہونہار قارئین آپ کی کہانیاں بے حد پسند کرتے ہیں۔

پڑھ رہے تھے لہٰذا خالی ہاتھ لوٹ گیا..... سردار کے سامنے میری پیشی ہوئی..... وہ بہت ناراض ہوا..... اب اس نے مجھے آخری موقع دیا ہے..... اگر میں آج بھی ناکام واپس گیا تو وہ مجھے گولی مار دے گا..... لیکن سیٹھ صاحب! میں اب جرم نہیں کر سکتا..... میرے اندر جرم سے نفرت پیدا ہو چکی ہے..... اور ایسا ایک عالم کی تقریر سننے سے ہوا..... تقریر کی وہ کیسٹ مجھے ایک تجوری ہی سے ملی تھی۔ نقدی کے ساتھ بے خیالی میں میں کیسٹ بھی اٹھا لے گیا..... پھر فرصت میں میں نے اس کو سنا..... اسے سنتے ہی میری تو گویا کایا ہی پلٹ گئی..... دنیا ہی بدل گئی..... اس کے بعد تین بار میں خالی ہاتھ لوٹا..... اب سردار نے قتل کرنے کی دھمکی دی ہے....." یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔

"بس بس' تمہارے اندر کا انسان جاگ گیا ہے..... تم فکر نہ کرو"۔

یہ کہہ کر سیٹھ خاور فون کے پاس گئے اور نمبر ملانے لگے۔

"یہ..... یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟..... پولیس مجھے گرفتار کر لے گی..... سردار اور باقی لوگوں کا کچھ نہیں بگڑے گا..... ان لوگوں کے ہاتھ بہت لمبے ہیں..... پولیس والوں سے ان کی ملی بھگت ہے"۔

سیٹھ خاور رک گئے اور سوالیہ انداز میں اسکی طرف دیکھتے ہوئے بولے: "تب پھر کیا کیا جائے"۔

"فون ہی کرنا ہے تو کسی آفیسر کو کریں جناب! وہ اپنے طور پر قدم اٹھائیں..... تبھی بات بنے گی"۔

سیٹھ خاور نے اس کے مشورے پر عمل کیا۔ اسی رات تمام ڈاکو گرفتار کر لیے گئے۔ جانی کی تعریف ہوئی۔ پولیس نے بھی اسے شاباش دی۔ عدالت نے باعزت بری کر دیا..... فیصلے کے روز عدالت میں سیٹھ خاور بھی موجود تھے۔ باہر نکلتے وقت انہوں نے پوچھا:

"اب تم کیا کرو گے جانی؟ کاش تم پڑھے لکھے ہوتے..... میں تمہیں اپنے کارخانے میں ملازم رکھ لیتا!"

میں بی اے پاس ہوں جناب!"

"کیا!" سیٹھ صاحب حیران رہ گئے۔

"جی ہاں! جب ملازمت کے سلسلے میں دھکے کھا کھا کر تھک گیا' تب سردار نے مجھے انٹرویو کے بہانے بلا لیا اور پھر اپنے گروہ میں شامل کیا"۔

"تم تعلیم یافتہ ہو' یہ تو بہت اچھی بات ہے..... بس اب تم خود کو ملازم سمجھو!"۔

اس کے بعد جانی یعنی جان محمد نے بہت ایمانداری سے کارخانے میں کام شروع کیا..... روز بروز اس کے جوہر کھلتے چلے گئے۔ وہ کارخانے میں ترقی کرتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ ایک دن منیجر بن گیا..... سیٹھ خاور اس کی ہر ممکن مدد کرتے تھے..... اسے بہت پسند کرتے تھے۔ اس کی دن رات کی محنت کی وجہ سے کارخانہ بھی خوب ترقی کر رہا تھا..... سیٹھ صاحب کی ایک ہی بیٹی تھی..... انہوں نے اس کی شادی جان محمد سے کر دی..... اس طرح جان محمد سیٹھ صاحب کی کوٹھی میں رہنے لگا..... ایک طرح سے سیٹھ خاور نے سب کچھ اسے سونپ دیا تھا۔

ایک دن جان محمد جیل میں سردار سے ملنے گیا..... سردار اسے دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا..... ساتھ ہی اس کے چہرے پر نفرت جھلکنے لگی۔

"غدار!" وہ غصے میں پھنکارا۔

"سردار! میرا اس روز چوری کرنا میرے لیے کس قدر مشکل تھا' تم سوچ بھی نہیں سکتے..... آج میں ایک کارخانے کا مالک ہوں..... اس دنیا میں جرم کر کے کبھی کوئی نہیں پھلا پھولا۔ تمہیں بھی میرا یہی مشورہ ہے..... جیل سے باہر آنے کے بعد اگر تم ایمان دارانہ زندگی گزارنا پسند کرو تو میں تمہاری ہر ممکن مدد کرنے کے لیے تیار ہوں"۔

"کک..... کیا واقعی"۔ سردار مارے حیرت کے ہکلایا۔

"ہاں..... واقعی"۔

جان محمد نے مسکرا کر کہا اور گرم جوشی سے ہاتھ ملا کر جانے کے لیے مڑ گیا۔

☆☆☆

نہ گرنا کمال نہیں' کمال یہ ہے
کہ تم گرو اور پھر ازسرنو اٹھ
کر کھڑے ہو جاؤ!

اس ہولناک اور حیران کن داستان کا آغاز 1750ء کو ہوا' جب سی کنگ (seaking) نامی ایک بڑا مال بردار جہاز آسٹریلیا سے امریکا کے لیے روانہ ہوا۔ سی کنگ نے چونکہ ایک طویل سفر طے کرنا تھا لہٰذا اس پر تقریباً تین سے چار ماہ تک کا راشن موجود تھا۔ عملے کی تعداد ساٹھ تھی اور بحری ڈاکوؤں سے بچاؤ کے لیے اس پر دو دو مار توپیں بھی نصب تھیں۔ ٹریور' جہاز کا کپتان انتہائی تجربہ کار بہادر اور با اصول انسان تھا اور اپنے عملے میں ہر دلعزیز تھا۔

ایک ہفتہ بڑے سکون سے گزر گیا۔ ویسے بھی بحرالکاہل میں جس میں سی کنگ رواں دواں تھا' بہت کم طوفان آتے ہیں۔ مگر دوسرے ہفتے کے چوتھے روز خلافِ توقع موسم کے تیور بگڑنا شروع ہو گئے اور شام ہوتے ہوتے زبردست موسلادھار بارش شروع ہو گئی۔ کپتان کے حکم سے بادبان گرا دیئے گئے اور جہاز

آہستہ آہستہ سفر کرتا رہا۔ آدھی رات کو زبردست طوفان آیا اور جہاز اپنے راستے سے بھٹک کر کہیں کا کہیں پہنچ گیا۔ صبح ہوئی تو طوفان کا زور ٹوٹ چکا تھا مگر یہ لوگ راستہ بھول چکے تھے۔ کپتان اور اس کے ساتھی اہلکار نقشہ دیکھ کر پریشان ہو رہے تھے اس لیے کہ جس مقام پر وہ سفر کر رہے تھے وہ نقشے میں کہیں نہیں تھا۔ یہ صورتِ حال کپتان ٹریور کے لیے بے حد حیران کن تھی۔ اس کے خیال میں وہ بحرالکاہل کے جنوب میں تھے مگر نقشہ اور قطب نما اس کی تردید کر رہے تھے۔ دوپہر کو زبردست طوفان نے پھر ان کو گھیر لیا۔ جہاز اب ایک تنکے کی طرح بہہ رہا تھا۔ جہاز کا عملہ اسے سیدھا رکھنے کی سرتوڑ کوشش کر رہا تھا۔ اچانک مشرق کی جانب' جس طرف ان کا رخ تھا انہیں انتہائی خطرناک چٹانیں نظر آئیں۔ عملے کی تمام تر کوشش کے باوجود جہاز بڑی تیزی سے اس طرف جا رہا تھا۔ کپتان نے حکم دیا کہ جلد سے جلد جہاز کو چھوڑ دیا جائے۔ دو کشتیاں جہاز سے گرائی گئیں اور بڑی پھرتی سے سارا عملہ ان میں منتقل ہو گیا۔ ان کے دیکھتے ہی دیکھتے جہاز ان چٹانوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا۔ دونوں کشتیاں بھی اس طرف بڑھ رہی تھیں۔ تاہم چپوؤں کی مدد سے بڑی مشکل سے ان کا رخ بدلا گیا۔ مگر فوراً ہی ایک بہت بڑی لہر نے دونوں کو اٹھا لیا۔ اب یہ ساٹھ بے بس انسان سمندر کی ہولناک لہروں کے رحم و کرم پر تھے۔ کشتیاں آناً فاناً ان کی پہنچ سے دور نکل گئیں۔

ٹونی نامی ایک نوجوان ملاح بھی ان بدنصیب ساٹھ افراد میں شامل تھا۔ بادلوں سے ڈھکے آسمان سے منوں ٹنوں کے حساب سے پانی برس رہا تھا۔ ٹونی کے سامنے اس کے کئی ساتھی لہروں کی نذر ہو گئے۔ لہروں سے لڑتے لڑتے اب اس کی طاقت بھی جواب دیتی جا رہی تھی۔ اسے بے اختیار اپنا گھر یاد آگیا۔ اسی لمحے اس سے ایک بڑا لکڑی کا شہتیر ٹکرایا۔ یہ فوراً اس سے چمٹ گیا۔ اس کے سرے پر کوئی اور بھی تھا۔ اس نے اپنے آپ کو پوری طاقت سے اس کے ساتھ چمٹا لیا اور گہری سانسیں لینے لگا۔ شہتیر بڑی تیزی سے بہہ رہا تھا۔ ٹونی پر تھکاوٹ اتنی غالب ہو گئی کہ اس سے شہتیر کو پکڑے رکھنا مشکل ہونے لگا۔ اس سے پہلے کہ وہ اس سے گر کر پانی میں غرق ہو جاتا اسے دو مضبوط ہاتھوں نے تھام لیا۔

"جوان اپنے آپ کو سنبھالو" یہ کپتان کی آواز تھی جو اس کے ساتھ اسی شہتیر سے چمٹا ہوا تھا۔ "قدرت ہمیں زندہ رکھنا چاہتی ہے اس لیے اس نے ہمارے لیے یہ سہارا بھیج دیا ہے"۔ کپتان نے اس کی ہمت بندھاتے ہوئے کہا۔ پھر آہستہ آہستہ بارش کا طوفان تھم گیا اور سمندر کی لہریں پرسکون ہونے لگیں۔ شام اب رات میں تبدیل ہو رہی تھی۔ ان کے چاروں طرف پانی ہی پانی تھا۔ یہ بڑی تیزی سے کسی نامعلوم منزل کی جانب بڑھ رہے تھے۔ "مجھے اُمید ہے کہ ہمیں جلد ہی کوئی چھوٹا موٹا جزیرہ نظر آجائے گا"۔ کپتان ٹریور نے آہستہ سے کہا۔ شدید سردی سے ان کے دانت بج رہے تھے۔ کپتان اگر ٹونی کو ہمت نہ دلاتا تو وہ کب کا ڈوب گیا ہوتا۔ "لڑکے سونا مت' نیند کو شکست دو! اگر تم سو گئے تو لڑھک کر سمندر میں جا گرو گے۔ مجھے ہو سکتا ہے کہ تم سے زیادہ نیند آرہی ہو"۔ کپتان نے اسے گویا حکم دیتے ہوئے کہا۔ آسمان پر اب اکا دکا بادل ستاروں سے آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ سمندر اب بالکل پرسکون تھا۔ ساری رات ان کا سفر جاری رہا۔ صبح سویرے سورج جب بلند ہوا تو انہیں ایک جزیرہ اپنی سمت میں ابھرتا نظر آیا۔ خوشی سے ان کے چہرے دمک اٹھے۔ "میرا خیال ہے کہ ہم دو گھنٹے تک اس جزیرے تک پہنچ جائیں گے"۔ کپتان نے کہا۔

آہستہ آہستہ اب جزیرے کے خدوخال واضح ہو رہے تھے۔ یہ ایک ہرا بھرا پرسکون سا علاقہ دکھائی دے رہا تھا۔ ان کی رفتار خاصی سست تھی اس لیے انہیں وہاں تک پہنچتے پہنچتے کافی دیر ہو گئی۔ ان کا شہتیر آخرکار اس جزیرے کی ابھری چٹانوں سے آلگا۔ یہ دونوں اتر کر خشکی پر آئے اور تھکن سے نڈھال ہو کر گر پڑے۔ ٹونی تو گرتے ہی نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ وہ کچھ ہی دیر سویا ہو گا کہ اسے کپتان نے جھنجوڑ کر بیدار کیا۔ "اٹھو لڑکے' مجھے یہ جزیرہ آدم خوروں کی آماجگاہ لگتا ہے۔ ہمیں فوراً کوئی محفوظ مقام تلاش کرنا چاہیے"۔ دونوں لڑکھڑاتے ہوئے آگے بڑھے۔ ان کے سامنے دو فرلانگ کے فاصلے پر جنگل تھا اور بہت دور سرسبز پہاڑ دکھائی دے رہے تھے۔ "میرا خیال ہے کہ ہم اس وقت بحرالکاہل کے جنوب میں ہیں"۔ کپتان نے خود کلامی کرتے ہوئے کہا۔ جزیرے پر عجیب سی خاموشی کا راج تھا اور انہیں صرف جھاڑیاں

نظر آرہی تھیں۔ کوئی پرندہ یا کیڑا مکوڑا انہیں نظر نہیں آرہا تھا۔ ریت بڑی سخت اور زرد رنگ کی تھی۔ دونوں خاموش' حیرت میں گم آگے بڑھ رہے تھے۔ آخر ریت کا سلسلہ ختم ہوا اور وہ جنگل میں داخل ہو گئے۔ "ہمیں پھونک پھونک کر قدم رکھنا ہو گا۔ یقیناً یہ علاقہ آدم خوروں کا مسکن ہو گا"۔ کپتان نے اسے خبردار کرتے ہوئے کہا۔ "میرے پاس اپنی تلوار اور یہ خنجر ہے' اسے تم رکھ لو"۔ کپتان نے خنجر ٹونی کے حوالے کر دیا۔ بھوک سے دونوں کا بہت برا حال تھا۔ ٹونی کی نظر ایک بیل پر پڑی جس سے انگور جیسے پھل لٹک رہے تھے۔ بھوک سے بیتاب ہو کر اس نے جونہی آگے بڑھ کر انگور اتارنے چاہے' بیل نے اسے بڑی مضبوطی سے جکڑ لیا۔ شاخیں لوہے کے مضبوط جال کی طرح اس کے جسم میں گھستی چلی جارہی تھیں۔ اس کے منہ سے چیخیں نکلنے لگیں۔ کپتان نے آگے بڑھ کر پوری طاقت سے تلوار چلائی اور اس کے تنے پر وار کیا۔ دوسرے وار پر شاخوں نے اسے چھوڑ دیا۔ ٹونی اوندھے منہ گر پڑا۔ کپتان نے اسے اٹھا کر ایک طرف کیا۔ اب دونوں اس بیل کی طرف پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ بیل کے تنے سے خون نکل رہا تھا۔ گاڑھا خون' یوں لگ رہا تھا جیسے کسی جانور کو ذبح کیا گیا ہو۔ "بھاگو بھاگو یہاں سے' ہم کسی شیطانی جزیرے میں آگئے ہیں"۔ کپتان نے یہ کہہ کر اس کا ہاتھ پکڑا اور پاگلوں کی طرح بھاگنے لگا۔ مگر یہ کہاں جاتے' ہر طرف جنگل ہی جنگل تھا جو غالباً سارے کا سارا آدم خور پودوں سے بھرا پڑا تھا۔ اس وقت یہ پودوں اور بیلوں سے بچ کر چل رہے تھے۔ آگے جا کر انہیں جو پودے نظر آئے وہ سارے کے سارے سرخ رنگ کے تھے۔

"کپتان صاحب! میرا تو یہ پہلا سفر ہے۔ آپ ہی کچھ بتائیں ہم کہاں ہیں اور یہ کس قسم کا جنگل ہے؟" ٹونی نے پہلی بار زبان کھولی۔ "لڑکے! میں نے ایسے پودے نہ کبھی دیکھے ہیں اور نہ ہی ان کے بارے میں سنا ہے"۔ کپتان نے جواب دیا۔

انہیں اب اپنے سائے سے بھی خوف محسوس ہو رہا تھا۔ بھیانک خاموشی اور خونی پودے' ان کے اعصاب جواب دیتے جا رہے تھے۔ گرمی کی شدت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا اور بھوک انہیں بہت بری طرح سے ستا رہی تھی۔ پیاس سے اب ان کے حلق میں کانٹے سے پڑنے لگے۔ ٹونی نے اپنی دائیں جانب ایک بیل میں بڑا سا پھل دیکھا۔ اس سے پہلے کہ کپتان اسے روکتا' وہ پیاس اور بھوک سے بیتاب ہو کر آگے بڑھا اور اس نے اپنے خنجر سے اس پھل کو الگ کر دیا۔ اس مرتبہ کچھ نہ ہوا۔ تاہم یہ فوراً پیچھے ہٹ گیا اور پھل کو کاٹ دیا۔ ڈرتے ڈرتے اسے چکھا تو اسے بے حد مزیدار پایا۔ دونوں نے اسے بڑے شوق سے کھایا۔ کچھ فاصلے پر ایسا ہی پھل اور موجود

تھا۔ اسے بھی فوراً استعمال میں لایا گیا۔ پھل کھا کر حیران کن طور پر ان میں طاقت سی آگئی اور وہ تیزی سے جنگل میں آگے بڑھنے لگے۔

"ہمیں ان پہاڑوں تک جانا ہو گا' ان کے پار یقیناً آبادی ہو گی" کپتان نے امید ظاہر کی۔ مگر اب انہیں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے پہاڑ بجائے قریب آنے کے' دور ہوتے جا رہے ہیں۔ سرخ جنگل شام ہوتے ہوتے ختم ہو گیا اور اب وہ ایک کھلی جگہ پر چل رہے تھے۔ یہاں بھی عجیب درخت اور پودے ان کے استقبال کے لیے موجود تھے۔ "میں تو اب ایک قدم بھی نہیں چل سکتا"۔ یہ کہہ کر ٹونی دھم سے ایک مخروطی ٹیلے کے نیچے بیٹھ گیا۔ کپتان کو بھی بیٹھنا پڑا۔

اندھیرا چھاتے ہی وہ دونوں سو گئے۔ دو چار گھنٹے ہی سوئے ہوں گے کہ تیز سیٹیوں کی آواز سن کر وہ اٹھ بیٹھے۔ درخت اور پودوں سے عجیب روشنی نکل رہی تھی اور چاروں جانب سے سیٹیاں سی بج رہی تھیں۔ یہ اوندھے منہ سجدے میں گر گئے اور خدا کو یاد کرنے لگے۔ ساری رات یہ سلسلہ جاری رہا اور وہ ڈرے دبکے خدا کو یاد کرتے رہے۔ دن نکلتے ہی سیٹیوں کی آواز تھم گئی اور پراسرار روشنیاں بھی غائب ہو گئیں۔ اب پھر ہر طرف بھیانک خاموشی چھا گئی۔ وہ دونوں ڈرتے' بدکتے آگے پڑھنے لگے۔ ایک جگہ انہیں زمین پر ٹماٹر جیسے پھل نظر آئے۔ ڈرتے ڈرتے انہیں چکھا۔ یہ بے حد میٹھے اور رسیلے تھے۔ دونوں نے خوب سیر ہو کر ان کا ناشتا کیا اور اپنی نامعلوم منزل کی طرف بڑھنے لگے۔ گرمی آج بھی بہت شدید تھی۔ دوپہر کے قریب انہیں ایک شہر کی باقیات نظر آئیں۔ وہ ان ہولناک کھنڈروں میں داخل ہو گئے۔ ویران عمارتیں' سنسان گلیاں اور ٹوٹے پھوٹے راستے دیکھ کر ان کے دل پر ہیبت سی طاری ہو گئی۔ ایک جگہ انہیں ایک تالاب نظر آیا۔ پانی غیر متوقع طور پر شفاف اور تازہ دکھائی دے رہا تھا۔ "میرا خیال ہے کہ ہم باری باری نہالیں" کپتان نے تجویز پیش کی۔ "تم یہاں رکو' میں پہلے اس تالاب میں اترتا ہوں"۔ کپتان نے اپنی تلوار نکال کر رکھی۔ جوتے جو جگہ جگہ سے پھٹ چکے تھے' اتارے اور گندے' میلے کچیلے کپڑوں سمیت اسی تالاب میں چھلانگ لگا دی۔ ٹونی اردگرد کا جائزہ لینے کے لیے آگے بڑھ گیا۔ تقریباً 5 منٹ بعد ہی کپتان

جنید احمد

شکاریات اور مہم جوئی کے حوالے سے ممتاز ادیب اور محقق جناب جنید احمد کی دلچسپ اور قدم قدم پر چونکا دینے والی کہانیاں بچوں اور بڑوں' سبھی حلقوں میں بے حد مقبول ہیں۔

پانی سے شرابور تالاب سے باہر آگیا۔ خوف سے اس کی رنگت پیلی ہو رہی تھی۔ ٹونی کے پاس جا کر اس نے اسے کچھ بتانا چاہا مگر خوف سے اس کی قوت گویائی جواب دینے لگی۔ "کپتان' کیا بات ہے؟ کیا دیکھا ہے آپ نے؟" ٹونی نے اسے جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا۔ کپتان کے حواس بحال ہوئے تو اس نے کہا "تمہیں یقین نہیں آئے گا لڑکے! اور تم سوچو گے کہ شاید میں پاگل ہو گیا ہوں لیکن خدا کی قسم میں نے ایسا دیکھا ہے"۔ یہ کہہ کر کپتان خوف زدہ نگاہوں سے تالاب کی جانب دیکھنے لگا۔ "جونہی میں نے غوطہ لگایا تو میں نے تہہ میں کچھ حرکت سی محسوس کی۔ پانی شفاف ہونے کی وجہ سے میں با آسانی دیکھ سکتا تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے تالاب کی تہہ میں دو ہونٹ' ہاں! بہت بڑے ہونٹ نمودار ہوئے اور ایک مہیب غار نما منہ نے مجھے نگلنے کی کوشش کی۔ میرا تیراکی کا تجربہ کام آیا ورنہ میں ضرور اس عفریت کا شکار ہو جاتا۔ ہماری سلامتی اسی میں ہے کہ ہم یہاں سے نکلیں!"

چنانچہ ان کا پراسرار سفر پھر شروع ہو گیا۔ اب پہاڑ انہیں نمایاں نظر آ رہے تھے اور وہ ان پر موجود جنگل با آسانی دیکھ سکتے تھے۔ اچانک انہیں انسانی آوازیں آنے لگیں۔ یوں لگ رہا تھا کہ جیسے قریب ہی کوئی آبادی ہو۔ انسانی آوازیں سن کر ان کی جان میں جان آئی اور وہ بھاگتے ہوئے اسی سمت چل دیئے۔ چڑھائی سے نشیب کی طرف آئے تو انہوں نے اپنے آپ کو ایک بہت بڑی بستی میں پایا۔ یہاں بازار اجناس سے بھرے ہوئے تھے' لوگ خرید و فروخت میں مصروف تھے۔ ایک جگہ بچے کھیل رہے تھے' لوہار بھٹی پر کام کر رہا تھا' بڑھئی کچھ بنانے میں مصروف تھا اور ایک جگہ

عورتیں باتوں میں مصروف تھیں۔ مگر یہ سب کے سب پتھر کے تھے۔ یوں لگ رہا تھا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے تک یہ جیتے جاگتے لوگ تھے کہ کسی جادوگر نے انہیں پتھر کا بنا دیا۔ کسی چہرے پر خوف کا نشان نہیں تھا۔ پتھر کے یہ انسان بے جان ہونے کے باوجود زندگی سے بھرپور دکھائی دیتے تھے۔ خوف سے ان کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اور وہ دونوں چیخیں مارتے ہوئے وہاں سے بھاگ اٹھے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ ان بتوں کے قریب سے گزرتے ہوئے انہیں کوئی آواز سنائی نہ دی مگر جونہی وہ اس بستی سے نکلے وہی آوازیں پھر شروع ہو گئیں۔ "یہ بھوت ہیں بھاگو یہاں سے بھاگو لڑکے' ورنہ ہم بھی پتھر کے بن جائیں گے"۔ کپتان نے اسے بھاگتے ہوئے خبردار کیا۔ اب ان کے سامنے پھر ایک گھنا جنگل تھا۔ اس جنگل سے گزر کر ہی یہ ان پہاڑوں تک پہنچ سکتے تھے جن کے بارے میں کپتان کا خیال تھا کہ ان کے دوسری طرف مہذب دنیا آباد ہو گی۔ جنگل بھی اس بستی کی طرح آباد تھا۔ شیر نے ہرن کو پکڑ رکھا تھا' ایک جگہ بہت بڑا اژدھا منہ کھولے بیٹھا تھا۔ درختوں پر بندر موجود تھے۔ پرندے درختوں پر حسبِ معمول بیٹھے تھے مگر سب کے سب پتھر کے تھے۔ یہاں بھی بالکل یہی لگ رہا تھا کہ ابھی ابھی انہیں تراش کر رکھا گیا ہے۔ "رات پڑنے سے پہلے کسی طرح اس منحوس جگہ سے نکلو" کپتان نے ٹونی کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا "خبردار کسی چیز کی طرف مت دیکھو۔ بس آگے بڑھتے جاؤ"۔ رات انہوں نے پہاڑوں کے پاس بسر کی۔ خوف سے وہ ساری رات جاگتے رہے اور عجیب و غریب آوازیں سنتے رہے۔ صبح ہوتے ہی وہ پہاڑ پر چڑھ گئے اور گرتے پڑتے' زخمی ہوتے تھکن سے چور شام تک چوٹی پر پہنچ گئے۔ "لو لڑکے! میرا خیال ہے کہ اب ہم شیطانی جنگل سے نکل آئے ہیں۔ صبح خدا نے چاہا تو اطمینان سے اتریں گے اور آباد دنیا میں پہنچ جائیں گے"۔ کپتان نے نیچے دور اندھیرے میں دیکھتے ہوئے کہا۔ رات ہوتے ہی یہ دونوں اطمینان سے سو گئے۔ یہاں انہیں کسی قسم کی آواز نے تنگ نہیں کیا۔ صبح ہوتے ہی انہوں نے نیچے اترنے کا آغاز کر دیا۔ "ٹھہرو مجھے اس شیطانی سرزمین کا آخری نظارہ کر لینے دو!" اتنا کہہ کر کپتان ایک بلند پتھر پر کھڑا ہو کر نیچے دیکھنے لگا۔ اتنے میں گھڑگھڑاہٹ سی ہوئی' پتھر فضا میں اچھلا اور کپتان سمیت لڑھکتا ہوا نیچے چلا گیا۔ یہ سب کچھ اتنا اچانک ہوا کہ کپتان چیخ تک نہ مار سکا۔ شیطانی سرزمین نے اپنی بھینٹ لے لی تھی۔ ٹونی شام تک روتا' پیٹتا نیچے وادی میں پہنچ گیا۔ یہاں کے لوگ بڑے مہربان ثابت ہوئے اور انہوں نے اسے کھانے پینے کو دیا۔ ایک بڑے بوڑھے نے اس کی داستان سن کر صرف اتنا کہا کہ "ہم صرف یہی جانتے ہیں کہ اس بستی پر خدا کا عذاب نازل ہوا تھا اور تم بہت خوش قسمت ہو کہ وہاں سے بچ نکلے ہو"۔

"ہاں! میں واقعی بڑا خوش قسمت ہوں" ٹونی نے یہ کہا اور رونے لگ گیا۔

☆☆☆☆☆

عقل مند انسان وہ ہے جو اپنے حق سے
کم لینے پر راضی ہو اور دوسروں کو ان کے حق
سے زیادہ دینے کے لیے تیار رہے۔

ایک بچہ اسکول دیر سے پہنچا تو استانی نے کہا:
"تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اسکول کا وقت آٹھ بجے ہے"۔
بچے نے کہا: "مس وقت کی پابندی بے حد ضروری ہے۔ آپ میرا انتظار نہ کیا کریں' بس پڑھائی شروع کر دیا کریں"۔
(فرقان اعجاز' لاہور)

ایک پاگل لوگوں کو اپنے کرتب دکھاتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ میں بغیر ہاتھ لگائے انڈہ توڑ سکتا ہوں۔ لوگوں نے پوچھا: وہ کیسے؟ تو اس نے پاؤں سے انڈہ توڑ کر کہا: یہ لو' میں نے بغیر ہاتھ لگائے انڈہ توڑ دیا ہے۔
(ثمرہ وحید' کامونکی)

ایک صاحب کھانے کے بہت شوقین تھے۔ کسی دعوت میں اتنا کھا گئے کہ پیٹ میں درد ہو گیا۔ بیوی نے کہا: دوا کھا لو' درد دور ہو جائے گا۔ وہ صاحب جلدی سے بولے: دوا کھانے کی گنجائش ہوتی تو ایک آدھ لقمہ اور نہ کھا لیتا۔
(مجاہد عارف انصاری' چوٹالہ جہلم)

باپ (بیٹے سے): "بیٹا دیکھو' میں تمہیں شریر لڑکوں کی صحبت سے دور رکھنا چاہتا ہوں"۔
بیٹا: "ابا جان! اسی لیے تو میں اسکول نہیں جاتا"۔
(محمد عاصم نور ساقی)

گاؤں میں بوڑھے خیر دین کی عمر ایک سو پندرہ برس ہوئی تو اس کے بارے میں شہر والوں کو بھی معلوم ہو گیا۔ اخباری نمائندے اس کی تصویریں کھینچنے کے لیے آنے لگے تو خیر دین کا پڑوسی علم دین ناک بھوں چڑھاتے ہوئے بولا: ایک تو مجھے ان شہر والوں کی سمجھ نہیں آتی۔ ایسے ست آدمی کی تصویریں کھینچنے کے لیے آگئے ہیں جس نے زندگی میں بوڑھا ہونے کے سوا کوئی کام ہی نہیں کیا اور اس میں بھی اتنے برس لگا دیئے۔
(نعمان علی' ملتان)

اکرم (ناصر سے): تم نے ایک کلو بادام کس لیے خریدے تھے؟"
ناصر: "اپنا حافظہ تیز کرنے کے لیے کیونکہ مجھے کوئی بات یاد نہیں رہتی!"
اکرم: "پھر ہوا حافظہ تیز؟"
ناصر: "نہیں یار' میں بادام کھانا ہی بھول گیا"۔
(محمد ثمران اوکاڑا)

ایک بچہ اپنے دوست سے: "میرے گھر میں 20 فٹ لمبی اور 10 فٹ چوڑی صابن کی ٹکیا ہے"۔
دوست: "تو تم اس کو پکڑ کر اپنے جسم پر کیسے ملتے ہو؟"
بچہ: "ہم اسے پکڑتے نہیں بلکہ اس پر بیٹھ کر پھسلتے رہتے ہیں"۔
(انیس بٹ' گوجرانوالہ)

آصف (کاشف سے): ٹائی کا سب سے بڑا فائدہ کیا ہے۔
کاشف: اسے اتارنے کے بعد بڑا سکون ملتا ہے۔
(فاخرہ نعمان' لاہور)

آپ بھی لکھیے

نیک عادت

عروبہ اعجاز' تلہ گنگ

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک بزرگ دریا کے کنارے وضو فرما رہے تھے۔ انہوں نے ایک کیڑے کو دریا میں ڈوبتے ہوئے دیکھا۔ باہر نکالنے کے لیے انہوں نے جونہی کیڑے کو پکڑا' اس نے ڈنگ مار دیا اور دوبارہ پانی میں گر گیا۔ فقیر کو پھر اس پر ترس آگیا۔ اس مرتبہ بھی اس نے ڈنگ مارا۔ اس طرح کیڑا بار بار پانی میں گرتا رہا اور بزرگ اسے باہر نکالتے رہے۔ کسی نے فقیر سے کہا: آپ ہر دفعہ کیڑے کو بچانے کی کوشش کرتے ہیں اور وہ ہر مرتبہ آپ کو ڈنگ مارتا ہے' اسے ڈوبنے دیں۔ بزرگ نے کہا "اگر کیڑا اپنی بری عادت نہیں چھوڑ سکتا تو میں اپنی نیک عادت کیوں چھوڑوں!" (پہلا انعام: 100 روپے کی کتابیں)

بااصول رہنما

مظہر سعید' سکھر

پاکستان بننے سے پہلے کی بات ہے' راجپوتانہ کے شہر جین میں دو خاندانوں کا جائیدار کے سلسلے میں کوئی جھگڑا چل رہا تھا۔ دونوں ہی ہندو خاندان تھے۔ ان میں سے ایک خاندان کے سربراہ وکالت کے لیے قائداعظم محمد علی جناحؒ کے پاس آئے۔ مقدمے کی تفصیل جاننے کے بعد موکل اور قائداعظم کے درمیان کچھ یوں گفتگو ہوئی:

موکل: جناب! آپ نے اپیل کے کاغذات تو دیکھ لیے ہوں گے۔

قائداعظمؒ: دیکھ تو لیے ہیں' مگر مجھے بے حد افسوس ہے کہ میں یہ کیس نہیں لڑ سکوں گا۔

موکل: کیوں جناب' ہم تو آپ کے پاس بہت سی امیدیں لے کر آئے تھے؟ فیس ہمارے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ ہم دو لاکھ تک پیش کر سکتے ہیں مگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ اپیل میں آپ ہماری طرف سے کھڑے ہوں' اور بس.....

قائداعظم: جناب آپ نے بالکل غلط اندازہ لگایا' فیس کی رقم خواہ دو لاکھ ہو یا اس سے زیادہ اصل میں بات کچھ اور ہے"۔

موکل: "وہ کیا؟"۔

قائداعظم: وہ یہ کہ جس روز اپیل ہے اسی روز مجھے اسمبلی میں ایک ضروری بحث میں حصہ لینا ہے اور یہ میری مجبوری ہے۔

ساتھیو! قائداعظمؒ کی وہ تقریر جو انہوں نے اس روز اسمبلی میں کی اور جس پر انہوں نے دو لاکھ کی بڑی رقم قربان کر دی' صرف دس منٹ کی تھی۔ لیکن بات دو لاکھ کی نہیں بلکہ صرف اور صرف "اصول پسندی" کی ہے! (دوسرا انعام: 90 روپے کی کتابیں)

جیسا کرو گے ویسا بھرو گے

قمر ناز دہلوی' کراچی

بہت دنوں کی بات ہے کہ ایک گاؤں سے تین دوست نیکو' رحیمو اور شیرو نوکری کی تلاش میں سفر پر روانہ ہوئے۔ راستے میں انہیں جھاڑیوں میں ایک تھیلا پڑا نظر آیا۔ انہوں نے جب اسے کھولا تو وہ سونے' چاندی اور اشرفیوں سے بھرا ہوا تھا۔ تینوں خوش ہو گئے کہ قسمت ان پر مہربان ہو گئی ہے۔ انہوں نے طے یہ کیا کہ اس دولت کو تین برابر حصوں میں تقسیم کر کے آپس میں بانٹ لیا جائے۔ اس دوران رحیمو اور شیرو نے نیکو سے کہا کہ: "تم گاؤں سے ہمارے لیے کھانا لے آؤ"۔

نیکو کھانا لینے چلا گیا۔ راستے میں اس نے سوچا کہ: کیوں نہ میں کھانے میں زہر ملا دوں جسے کھاتے ہی یہ دونوں مر جائیں اور مجھے ساری دولت مل جائے۔

ادھر رحیمو اور شیرو نے نیکو کے جانے کے بعد مشورہ کیا کہ: ہمیں کیا پڑی ہے جو ایک حصہ نیکو کو دیں۔ کیوں نہ اس کے واپس آتے

ہی اس کو مار ڈالیں اور ساری دولت آپس میں بانٹ لیں۔ چنانچہ نیکو جب کھانا لے کر واپس آیا تو انہوں نے اس کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور پھر کھانے پر ٹوٹ پڑے۔ لیکن کھانا کھاتے ہی وہ دونوں بھی ہلاک ہو گئے اس لیے کہ اس میں زہر ملا ہوا تھا۔ واقعی یہ سچ ہے کہ: "جیسا کرو گے ویسا بھرو گے" (تیسرا انعام: 80 روپے کی کتابیں)

دودھ میں پانی

کاشف علی' جہانیاں

ایک گوالا پہاڑ کے دامن میں رہتا تھا۔ وہیں اپنی گائیں بھی رکھتا تھا۔ دن بھر گائیں ادھر ادھر گھاس چرتی رہتی تھیں۔ شام سے پہلے وہ دودھ دوہتا اور اس میں بہت سا پانی ملا دیتا۔ گاہک اکثر شکایت کرتے کہ دودھ پتلا ہوتا ہے مگر وہ ایک کان سے سنتا اور دوسرے کان سے اڑا دیتا۔ ایک دن یکایک سیاہ گھٹا اٹھی۔ گوالا بہت خوش ہوا کہ اب مینہ برسے گا' گھاس بڑھے گی' گائیں کھائیں گی اور زیادہ دودھ دیں گی۔ اتنے میں بادل گرجا' بجلی چمکی اور موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ پہاڑوں سے پانی کا سیلاب اترا اور اس شدت سے بڑھا کہ گوالے کی ساری گائیں اور جو کچھ گھر میں جمع تھا بہا کر لے گیا۔ اب گوالے کے پاس نہ گائیں رہیں نہ نقدی۔ وہ گھبراہٹ میں ہر شخص سے کہتا تھا کہ: میں نے ایسا سیلاب نہ کبھی دیکھا نہ سنا تھا' معلوم نہیں اتنا پانی کہاں سے آگیا؟ ایک عقل مند نے کہا: یہ وہی پانی ہے جو تم دودھ میں ملایا کرتے تھے۔ خدا نے اسی پانی کو سیلاب بنایا اور تمہیں بے ایمانی اور بددیانتی کی سزا دی۔

(چوتھا انعام: 70 روپے کی کتابیں)

وعدہ

فائزہ حسن' میاں چنوں

ایک دن سعد اسکول سے واپس آیا تو اس نے کھانے کی میز پر ایک بزرگ مہمان کو دیکھا۔ اس کے والد نے بتایا کہ یہ تمہارے مرحوم دادا ابو کے دوست اور میرے عزیز چچا ہیں۔ کھانے کے بعد باتوں باتوں میں اس کے والد نے اس کے ناپسندیدہ دوستوں کے متعلق شکایت کرتے ہوئے بتایا تو ان بزرگ نے سعد کو بلایا اور کہنے لگے "دیکھو بیٹا' میں تمہیں دوستوں سے منع نہیں کرتا لیکن پڑھائی زیادہ اہم ہے۔ ایک بات یاد رکھنا جس کے پڑھائی کے دوران زیادہ دوست ہوتے ہیں اس کا بعد میں کوئی دوست نہیں ہوتا' اور جس کا پڑھائی کے دوران کوئی دوست نہیں ہوتا بعد میں سارے اس کے دوست ہوتے ہیں۔ اب تم وعدہ کرو کہ فضول دوستیاں چھوڑ کر صرف پڑھنے پر توجہ دو گے!"۔ ان کی بات میں اتنی تاثیر تھی کہ سعد نے فوراً وعدہ کر لیا۔ اس کے بعد اسکول کے نالائق طلبا میں شامل ہونے والا سعد پوزیشن ہولڈر بن گیا۔ غلط دوستیاں چھوڑنے کی وجہ سے اس کے پاس بہت سارا وقت بچ جاتا اور وہ خوب دل لگا کر پڑھائی میں مصروف رہتا۔

پڑھائی مکمل کرنے کے بعد سعد ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہو گیا۔ وہ جہاں سے گزرتا لوگ اسے سلام کرتے اور ہر کوئی اس کی دوستی پر فخر کرتا۔ واقعی آج اس کے ڈھیروں دوست تھے۔

(چھٹا انعام: 50 روپے کی کتابیں)

مسلسل کوشش

محمد عمران' پیلاں

ایک روز فیصل اور اس کے ماموں سیر کے لیے قریبی باغ کی طرف جا رہے تھے کہ ماموں نے دیکھا کہ فیصل کچھ پریشان دکھائی دے رہا ہے۔ ماموں نے پریشانی کی وجہ پوچھی تو اس نے بتایا کہ: ہیڈ ماسٹر صاحب نے ایک طویل نظم زبانی یاد کرنے کا حکم دیا ہے اور کہا ہے کہ جو یاد کر کے آئے گا اسے انعام دیا جائے گا۔ میرا انعام لینے کو جی تو چاہتا ہے لیکن نظم اتنی لمبی ہے کہ کسی طرح یاد نہیں ہوتی۔

ماموں بولے: "بس اتنی سی بات؟" وہ چیونٹی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے: دیکھو' یہ بے چاری چیونٹی کتنی مشکل سے درخت پر چڑھ رہی ہے۔ اس کی رفتار کتنی سست ہے اور اس کی منزل بھی بہت دور ہے۔ یہ چڑھتے چڑھتے گر بھی جاتی ہے۔ لیکن پھر بھی حوصلہ نہیں ہارتی اور اپنی منزل کو پہنچ کر ہی دم لیتی ہے۔ جانتے ہو اس کی کامیابی کا راز کیا ہے۔ صرف اور صرف مسلسل کوشش۔ اگر تم بھی تھوڑی تھوڑی نظم مسلسل یاد کرتے رہو تو پوری نظم اچھی طرح تمہیں یاد ہو جائے گی"۔ یہ بات فیصل کے دل میں گھر کر گئی۔ چنانچہ لگاتار محنت اور کوشش کے سبب اسے نظم زبانی یاد ہو گئی اور وہ نہ صرف اسکول بھر میں اول رہا بلکہ نقد انعام کا مستحق بھی ٹھہرا۔ (چھٹا انعام: 50 روپے کی کتابیں)

"کتنے بھلکڑ ہیں یہ لوگ!" اس نے مرغی کی بچی کھچی بوٹی کو منہ میں ڈالنے سے قبل سوچا۔ "لاکھوں روپے خرچ کر کے اتنی بڑی دعوتیں کرتے ہیں اور مجھے..... بلانا بالکل بھول ہی جاتے ہیں"۔ اس کے ماتھے پر سلوٹیں ابھریں' کچھ سنجیدگی ہوئی اور پھر ہلکا سا تبسم اس کے لبوں پر پھیل گیا۔

"ارے بھول جاتے ہیں تو بھول جائیں!" اس نے اپنے آپ سے کہا۔ "میں تو ان کو فراموش نہیں کرتا ناں"۔ اب اس کا بوٹی والا ہاتھ منہ کی طرف گیا۔ ابھی وہ اس لذیذ بوٹی کو پوری طرح منہ میں ڈال بھی نہیں سکا تھا کہ ایک زور دار ہاتھ اس کی گدی پر پڑا۔ بوٹی اس کے منہ سے نکل کر ہال کے فرش پر بکھری ہڈیوں میں شامل ہو گئی۔

"اوئے تم لوگ سدھرو گے نہیں؟" سیکیورٹی گارڈ نے ہاتھ کے بعد زبان چلائی۔ "آجاتے ہیں' بھک منگے' مفتا کھانے!" اس نے بڑی گول گول آنکھوں کو گھماتے ہوئے کہا۔ اب وہ مونچھوں کو تاؤ دے رہا تھا۔ "تمہیں شرم نہیں آتی اس طرح بلا دعوت گھستے ہوئے!"

"مم..... میں..... وہ....." اس طرح رنگے ہاتھوں پکڑے جانے پر وہ ہکلا کر رہ گیا۔

"تم لوگوں کی بھوک کسی طرح مٹتی ہی نہیں!"۔ دور سے منیجر نے تاؤ کھا کر کہا۔ "گارڈ! اسے باہر کا راستہ دکھاؤ"۔

"ہم تو بڑے لوگوں کا جھوٹا کھا کر اپنے پیٹ کی....." اس کا جملہ ادھورا ہی رہ گیا۔ گارڈ فالتو باتیں سننے کا عادی نہیں تھا۔ اس نے زور سے اس کی کمر پر ایک گھونسا رسید کیا۔

"ابے' اپنی چور بازاری کو جائز قرار دیتا ہے"۔ وہ شاید اس طرح کے مفت خوروں سے بے حد پریشان تھا۔ اب کی بار اس نے اپنی مٹھی میں اس کے بال جکڑ لیے اور کھینچ کر ہال کے مرکزی دروازے پر لے آیا۔ اس نے مزاحمت کی کوشش کی لیکن صحت مند جوان گارڈ کے آگے اس کی ایک نہ چل سکی۔ ہال کی سیڑھیوں سے اتار کر گارڈ نے

اسے ایک زبردست ٹھوکر ماری۔ وہ دور جا گرا۔

ہال سے نکلتے ہوئے مہمان اس کی بے عزتی پر مختلف تبصرے کرتے ہوئے جا رہے تھے۔ ادھر اس کا معدہ اس مار پیٹ سے پریشان ہو کر وہ سب کچھ اگل دینا چاہتا تھا جو کچھ دیر پہلے اس نے میز کے نیچے گھس کر اور پلیٹوں کے درمیان سے اچک کر کھایا تھا۔ اتنے میں ایک ابکائی آئی اور وہ سارا "مقا" اس نے سڑک پر انڈیل دیا۔

☆☆☆

غفران صاحب کاٹن کے انتہائی نفیس جوڑے میں ملبوس صوفے پر دراز' پُرمسرت لہجے میں کچھ گنگنا رہے تھے۔ ان کے سگار سے نکلنے والا خوشبودار دھواں لاؤنج میں بکھر رہا تھا۔ اتنے میں وہ آنکھیں بند کیے اپنے مستقبل کے سنہرے منصوبوں پر غور کر رہے تھے۔ کچھ دیر قبل ان کے گھر ایک ضیافت منعقد ہوئی تھی جس میں شہر کے بڑے رؤسا اور سرکاری افسران شریک تھے۔ اس طرح کی دعوتیں سال میں کئی بار ان کے ہاں ہوتی تھیں۔ یہ دعوتیں کسی کشادہ دلی کے سبب نہیں بلکہ اپنے مفادات کے حصول کے لیے ہوتی تھیں۔ ان کا کنسٹرکشن کا کام ان دنوں عروج پر تھا۔ مختلف بوسیدہ اور پرانی بڑی بڑی عمارتوں کو خرید کر اور نئے پراجیکٹس کا اعلان کر کے ان پر بلڈنگیں کھڑی کر دینا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ اس کام میں ان کی معاونت کئی سرمایہ دار کر رہے تھے لیکن اس کمپنی کے پیچھے اصل نام اور کام انہی کا تھا۔ ان کی زبان کی شیرینی اور دعوت کے کھانوں کی لذت نے کئی بڑے لوگوں کو ان کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ وہ ان کی کسی فائل کی راہ میں رکاوٹ آنے ہی نہیں دیتے تھے۔ کسی بھی نئے پراجیکٹ کے افتتاح سے قبل ان کی کوٹھی پر افسران کو ضرور مدعو کیا جاتا اور بس..... پھر ان کے تمام کام فٹافٹ ہو جاتے۔

آج بھی محکمہ پلاننگ اینڈ ڈیولپمنٹ' بلدیہ اور دیگر اداروں کے سربراہان نے ان کے نئے پراجیکٹ کو زبانی سراہ کر گویا NOC (منظوری کا سرٹیفکیٹ) دے دیا تھا۔ اب غفران صاحب تصور میں اسی پراجیکٹ کو مکمل ہوتے دیکھ رہے تھے۔ دو خادمائیں سامنے پڑی بڑی سی ڈائننگ ٹیبل سے برتن سمیٹنے اور صفائی کرنے میں مصروف تھیں۔

"صاحب! اتنا کھانا کھلانے کے باوجود کافی فریش کھانا بچ گیا ہے"۔ خانساماں نے کچن سے آتے ہوئے کہا۔ "اب اس کھانے کا کیا کرنا ہے؟" وہ صاحب کے قریب جا کر مئودب کھڑا ہو گیا۔

"کرنا کیا ہے' تمام کھانا پلاسٹک کے ڈبوں میں الگ الگ پیک کر کے فریزر میں رکھ دو"۔ انہوں نے ادھ کھلی آنکھوں کو ملتے ہوئے جواب دیا۔ "لیکن صاحب! فریزر میں تو پچھلی دعوت کا کھانا بھرا پڑا ہے"۔ خانساماں کا خیال تھا کہ اگر وہ فریج میں جگہ نہ ہونے کا کہے گا تو صاحب شاید کھانا ان لوگوں کو لے جانے کے لیے کہہ دے۔ فریج میں نئے کھانے کو رکھنے کے لیے پرانے کھانے کو نکالنا ضرور ہو چلا تھا۔

"تو اسے نکال باہر کرو"۔ صاحب نے قدرے اکڑ کے ساتھ کہا۔ ایک خادمہ نے سوچا کہ اس موقع سے فائدہ اٹھایا جائے۔

"صاحب! کیا وہ کھانا ام لے جاوے"۔ وہ کچھ سہم کر بولی۔

"کیا تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ اتنی محنت سے بنوایا ہوا قیمتی کھانا تمہارے حوالے کر دوں؟"۔ وہ چڑ کر بولے۔

"تو پھر فرج سے نکلنے والے پرانے کھانے کا کیا کیا جائے؟"۔ خانساماں نے سوال کیا۔

"بہت ہی عجیب آدمی ہو' تمہیں نہیں معلوم میرے کتے ان دعوتی ڈشوں کو کتنا پسند کرتے ہیں!"۔ غفران صاحب نے حل نکالتے ہوئے کہا۔ "کھانا نارمل ہو جائے تو کتوں کی دعوت کر دینا"۔

دونوں ماسیوں کے چہرے پر اداسی کا رنگ آ جا رہا تھا۔ وہ سیٹھ کی اس حرکت پر حیران تھیں کہ باسی کھانا بھی وہ غریبوں کو دینے میں خوش نہیں لیکن کتوں کو دینے پر کتنا مسرور ہے۔

☆☆☆

غفران صاحب خوش خوش تیاریوں میں مصروف تھے۔ آج انہیں وفاقی وزیر ہاؤسنگ و تعمیرات کی جانب سے دیے گئے ایک ڈنر میں شرکت کرنا تھی۔ اس ڈنر میں ان کی شرکت کسی اعزاز سے کم نہیں تھی۔ ان کا نام اور کام ایسا چل نکلا تھا کہ وفاقی سطح تک وہ ایک نامور بلڈر کے طور پر پہچانے جانے لگے تھے۔ اس وقت وہ ان امور پر غور کر رہے تھے جن پر وہ وزیر سے بات کرنا چاہ رہے تھے۔

"صاحب! برابر والے شیخ صاحب آئے ہیں"۔ ملازم نے آ کر ان کی سوچوں کا سلسلہ منقطع کیا۔

"انہیں بھیجو!" انہوں نے چند لمحے سوچا' پھر ٹائی کو درست کرتے ہوئے بولے۔

"السلام علیکم غفران صاحب!" شیخ صاحب نے روایتی جوش کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"وعلیکم..... اور سنایئے کیسے ہیں شیخ صاحب!" وہ لبوں پر بناوٹی مسکراہٹ لاتے ہوئے بولے۔

"جی اللہ کا شکر ہے۔ ویسے غفران صاحب اس وقت تو آپ نمبرون جارہے ہیں"۔ شیخ صاحب نے ان کی تعریف کی۔

"بس آپ جیسے دوستوں کی دعائیں اور تعاون ہے"۔ وہ انکساری سے بولے۔

شیخ صاحب کچھ دیر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد ان سے گھر کی صفائی کے لیے ویکیوم کلینر مانگ بیٹھے۔

"افوہ شیخ صاحب! جانے اس کلینر میں کیا خرابی ہو گئی ہے کہ کاریگر اب تک درست کر کے ہی نہیں لایا!"۔

شیخ صاحب جو کافی دیر سے ان کے ساتھ بیٹھے خوش گپیاں کر رہے تھے ان کے اس جواب سے اداس چہرہ لیے واپس چلے گئے۔

"دیکھو! کلینر بیگم کے کمرے میں پڑا ہے۔ اسے لے کر فوراً اسٹور میں چھپا دو"۔ وہ نوکر کو ہدایت دیتے ہوئے بولے۔ "کہیں ایسا نہ ہو کہ بیگم شیخ آئیں اور کمرے میں کلینر رکھا دیکھ لیں"۔ وہ معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔

بہترین قسم کے تھری پیس سوٹ کے ساتھ وہ شام 7 بجے دعوت میں جانے کے لیے کوٹھی سے نکلے۔ اپنے پوش علاقے کی اندرونی گلی سے نکل کر وہ مرکزی شاہراہ میں داخل ہوئے ہی تھے کہ ایک 14`15 سالہ لڑکا ایک دم بھاگتا ہوا ان کی جیپ کے سامنے آگیا۔ بریک کی چرچراہٹ کے ساتھ گاڑی لڑکے سے محض چند انچ کے فاصلے پر جام ہو گئی۔ وہ لڑکا گھبرائے بغیر وہاں سے ہٹا اور صاحب کی کھڑکی کے پاس آیا۔

"تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہے"۔ وہ اپنے روایتی غصے سے چلائے۔

"میری خالہ کو بچا لیجئے صاحب!" وہ گاڑی کا دروازہ کھینچتا ہوا بولا۔

"ارے ہٹو بھکاری کہیں کا!" انہوں نے اس کا ہاتھ دروازے سے ہٹاتے ہوئے کہا۔

"میں بھکاری نہیں ہوں۔ میری خالہ کو ٹی بی ہو گئی ہے صاحب!" وہ گڑگڑایا۔

"تو میں کیا کروں؟"۔ وہ رعونت بھرے لہجے میں بولے۔

"میری ماں بھی ٹی بی میں مر گئی تھی' اب خالہ ہی میرا سہارا ہے"۔

"دیکھو میرا وقت خراب نہ کرو۔ میں تم جیسے بھکاریوں کو ایک دھیلا نہیں دیتا"۔ انہوں نے دروازے کو اندر کی طرف کرتے ہوئے زور سے بند کیا۔ لڑکا بے قابو ہو کر لڑکھڑایا لیکن گرنے سے بچ گیا۔

وہ پھر جیپ کی طرف لپکا۔ غفران صاحب اسے اس کی اس حرکت مزہ چکھانے کے لیے جیپ سے اتر آئے۔ وہ لڑکا قریب آکر بولا۔

"مجھے بھیک نہیں چاہیے! میری خالہ کا سرکاری سینی ٹوریم میں داخلہ کرادیں"۔ وہ معصوم سا چہرہ لیے ان کے بالکل قریب آگیا۔ اس نے بے اختیار ان کا کوٹ دونوں ہاتھوں سے تھام لیا اور اسے کھینچ کر التجا کرنے لگا۔

"ابے چھوڑ!" انہوں نے شدید طیش میں آکر اس کے دونوں ہاتھ چھڑائے اور اسے دور دھکا دیا۔ وہ ایک بار پھر لپکا۔

"صاحب! بغیر سفارش کے ٹی بی ہسپتال میں داخلہ نہیں ملتا۔ وہ مر جائے گی صاحب!" وہ ان کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے ان کے قریب پہنچا۔ انہوں نے اپنے غصے کے اظہار کے طور پر اپنے پاؤں سے ایک زبردست ٹھوکر ماری۔ وہ دور جا گرا۔ وہ کوٹ کو درست کرتے ہوئے اپنی سیٹ پر دراز ہو گئے۔ گاڑی لڑکے کے منہ پر دھواں چھوڑتی ہوئی اپنی منزل کی جانب روانہ ہو گئی۔

☆☆☆

الٹی کرنے کے کچھ دیر بعد اس کی طبیعت ہلکی ہوئی تو وہ اٹھا۔ نہ جانے اسے کیا ہو گیا تھا کہ اب بھی ہال کی مخالف سمت جانے کے بجائے وہ ہال کی طرف بڑھنے لگا۔ اسے شاید ابھی کچھ اور مار درکار تھی۔ وہ اندر داخل ہو گیا۔ تمام مہمان رخصت ہو چکے تھے۔ ہال کا عملہ اپنا اپنا حصہ سمیٹنے میں مصروف تھا۔ نچلے ملازمین ڈشوں سے بچا ہوا کھانا شاپرز میں بھر رہے تھے جبکہ بڑے ملازمین دیگوں کی کھرچن صاف کر کے خوش ہو رہے تھے۔ گارڈ اور دیگر ملازمین نے جب اس ہونق شخص کو ایک بار پھر دیگوں کی طرف آتا دیکھا تو بپھر گئے۔ ان کا خیال تھا کہ شاید یہ ان کے حصے کا مال اڑانے آگیا ہے۔ دو تین لوگ آگے بڑھے اور اسے کچھ کہے سنے بغیر گھسیٹتے ہوئے ہال کے مرکزی دروازے تک لائے اور سیڑھیوں سے نیچے اتار دیا۔ اس کے بعد گارڈ نے اسے ایک زبردست ٹھوکر ماری۔ وہ دور جا گرا۔ سڑک سے سر ٹکرایا تو خون بہہ نکلا۔ اس پر غشی سی طاری تھی۔ وہ کچھ دیر یونہی پڑا رہا۔ ہوش میں آنے کے بعد وہ تھکے قدموں سے ایک طرف چلا۔ سڑک کے ایک طرف واقع پان کے کیبن پر قرآنی آیات کی کیسٹ چل رہی تھی:

"کیا تم نے اس شخص کو دیکھا جو روزِ جزا کو جھٹلاتا ہے؟ یہ وہی بدبخت ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہیں دیتا۔ ایسے نمازیوں کے لیے خرابی ہے جو اپنی نماز سے غافل رہتے ہیں۔ جو ریاکاری کرتے ہیں اور معمولی ضرورت کی چیز بھی لوگوں کو عاریتاً نہیں دیتے"۔

اس کے ذہن میں ایک روشنی سی کوند گئی۔ اسے ایسا لگا کہ جیسے یہ سب کچھ اسی کے لیے ہی کہا جا رہا ہو۔ ماضی کی تمام کہانی اس کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگی۔ وہ دیوانگی سے شعور کی دنیا میں واپس آرہا تھا۔

"میں ہی تو ریاکار ہوں۔ دکھاوے کے لیے لاکھوں خرچ کیے اور ضرورت مند کو پانچ دس روپوں کے لیے بھی ترسایا' یتیموں کو دھکے دیئے' بھوکوں کو کھانا دینے کے بجائے کچرے کے ڈھیر پر پھینکوا دیا۔ میں تکبر میں مبتلا ہو گیا تھا۔ ہاں..... میں اپنے غرور میں روز جزا کو بھول چکا تھا اس لیے میں نے جو چاہا وہ کیا۔ مگر اللہ کا انصاف..... وہ تو مل کر رہتا ہے"۔

آج غفران صاحب اپنے ساتھ انصاف کر رہے تھے جب کہ وقت ان کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ ان کی بنائی ہوئی وہ بلند عمارتیں جب یکے بعد دیگر دھڑام سے نیچے آرہیں تو ان کی ساکھ متاثر ہو کر رہ گئی۔ سرمایہ کاروں نے سرمایہ نکالنا شروع کر دیا۔ لوگوں کا قرضہ چکانے کے لیے وہ بنکوں کے مقروض ہو گئے۔ سرکاری سطح پر ان کی کھنچائی ہوئی۔ عوام میں سے بھی دو تین افراد نے عدالتوں میں مقدمے دائر کر دیئے۔ ان کی رہن شدہ کوٹھی نیلام ہو گئی۔ وہ اکیلے تو تھے ہی مختلف طرح کے حادثات نے ان کے حواس چھین لیے۔ وہ سڑک پر آگئے۔ ماضی کے باوقار غفران صاحب اب دیوانوں کی صورت پھرتے تھے۔ کبھی کہیں سے مانگ کر کھا لیا تو کبھی کسی کچرا گھر سے کچھ اٹھا کر منہ میں رکھ لیا اور کبھی شادی ہالوں سے بچا کچا اٹھا کر اپنے پیٹ کی آگ بجھا لی۔ اس طرح کا بچا ہوا کھانا کھانے کے لیے بھی کبھی کبھی انہیں مار پڑتی تھی' کبھی گالیاں اور کبھی کبھار زور دار ٹھوکر ان کا مقدر ہوتی تھی۔ ☆☆☆☆☆

دن بہرحال بارہ گھنٹے میں ختم ہو جائے گا'
خواہ آپ اس کو استعمال
کر رہے ہوں یا برباد!

میرے پسندیدہ اشعار

آپ کے پسندیدہ شعروں پر مبنی "تعلیم و تربیت" کا نیا دلچسپ سلسلہ!

میں سو جاؤں یا مصطفیٰ کہتے کہتے
کھلے آنکھ صلے علیٰ کہتے کہتے
(محمد عبید الرحمان، راولپنڈی)

وہ شمع اجالا جس نے کیا چالیس برس تک غاروں میں
اک روز جھلکنے والی تھی سب دنیا کے درباروں میں
(عائشہ رحمان، ہارون آباد)

نہیں ہے چیز نکمی کوئی زمانے میں
کوئی برا نہیں قدرت کے کارخانے میں
(مریم سہیل، مقام نامعلوم)

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوق یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
(عبیداللہ، کوئٹہ)

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلماں
(محمد اویس، گوجرانوالہ)

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف
(محمد رضوان، چکوال)

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی آن نئی شان
گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان
(زوہیب خالد، لاہور)

عروجِ عزت و عظمت کی انتہا دیکھو
خدا نے رکھ دیا جنت کو ماں کے پاؤں میں
(وقار نیازی، کندیاں)

اے خدا! اے خالقِ کون و مکاں!
تو ہے بے شک بادشاہِ دو جہاں!
سیدھے رستے پر چلا ہادی ہے تو
ہم کو دکھلا دے تو منزل کا نشاں!
(عاشفہ سلیم، گوجرانوالہ)

اک موج بھی مل جائے اگر مجھ کو صلے میں
گرتے ہوئے دریا کو سمندر سے نکالوں
(فاریہ نور، کراچی)

اونچا رکھنا نام وطن کا، کرنا دل سے پیار
اس کی خاطر سب کچھ سہنا، جان بھی دینا وار
(جیو عامر خان نیازی، میانوالی)

تمنا دردِ دل کی ہو تو خدمت کر فقیروں کی
نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں
(نفیس کوکب، پشاور)

تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں
(نوید شیروانی، اسلام آباد)

فانوس بن کے جس کی حفاظت ہوا کرے
وہ شمع کیا بجھے جسے روشن خدا کرے
(زنیرہ طاہر، فیصل آباد)

خطائیں دیکھتا بھی ہے، عطائیں کم نہیں کرتا
سمجھ میں آ نہیں سکتا، وہ اتنا مہربان کیوں ہے!
(نازیہ ظفر، لاہور)

مری زندگی کا مقصد ترے دیں کی سرفرازی
میں اسی لیے مجاہد، میں اسی لیے نمازی
(سلمان جاوید، کراچی)

دیکھ لیتی ہے جہاں عزم و یقیں کے پیکر
رخ بدلتی ہے وہاں گردشِ دوراں اپنا
(عنبرین یوسف، ہرنائی)

نکہتِ گل ہی نہیں خاک بھی ہے ہم کو عزیز
اپنا صحرا ہے، چمن اپنا، خیاباں اپنا!
(عون رضا، لاہور)

اٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے
(محمد نوریز اقبال، فیصل آباد)

درویش کو طلب تھی متاعِ خلوص کی
مخلوق چپ رہی کہ یہ مشکل سوال تھا
(رابعہ جان، چکوال)

ایسے رہا کرو کہ کریں لوگ آرزو
ایسا چلن چلو کہ زمانہ مثال دے
(شاداب علی، کوئٹہ)

حالات کے قدموں میں قلندر نہیں گرتا
ٹوٹے بھی جو تارا تو زمیں پر نہیں گرتا
گرتے ہیں سمندر میں بڑے شوق سے دریا
لیکن کسی دریا میں سمندر نہیں گرتا
(ایم نیاز، رحیم یار خان)

ابھی بادبان کو تہہ رکھو، ابھی مضطرب ہے رخ ہوا
کسی راستے میں ہے منتظر، وہ سکوں جو آ کے چلا گیا
(نورین اشرف، جلالپور)

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کروبیاں
(صومعہ کنول، گجرات)

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات
(سجاد تابانی، حیدر آباد)

ہم لائے ہیں طوفاں سے کشتی نکال کر
اس ملک کو رکھنا میرے بچو، سنبھال کر
(رافعہ خالد، کراچی)

ہر گلی خاموش سی ہے سب دریچے بند ہیں
دوستو! یہ شہر اتنا بے صدا کیسے ہوا؟
قابلِ تعزیر تھا ہر جرم جس کا منصفو!
کچھ کہو پھر اس کے حق میں فیصلہ کیسے ہوا؟
(سعید اقبال رضا، میاں چنوں)

نہ دنیا سے نہ دولت سے نہ گھر آباد کرنے سے
تسلی دل کو ہوتی ہے خدا کو یاد کرنے سے
(قدیر احمد، میرپور آزاد کشمیر)

اوجھل خاکے اوجھل خاکے اوجھل خ

نیچے دی گئی تصویر میں 13 خاکے چھپے ہوئے ہیں.....
جن میں چاند، گھنٹی، مچھلی، چوہا، چمچہ، خرگوش، پرندہ، نکٹائی، بطخ، مینڈک، چیونٹی، نیولا اور کھانے کا کانٹا ہیں۔

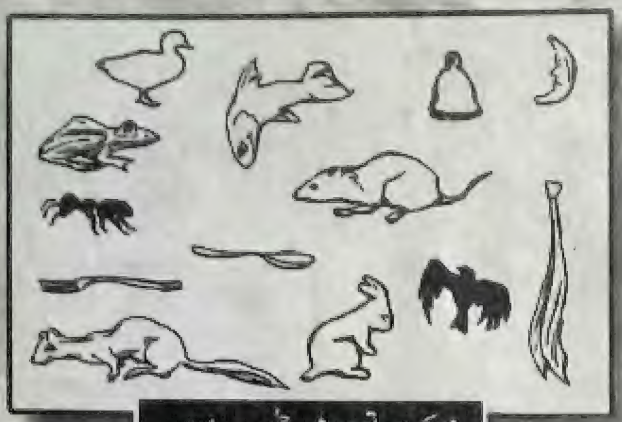

یہ خاکے اس تصویر میں چھپے ہوئے ہیں۔

کھوج لگائیے!

ذہانت آزمائیں اور 500 روپے کی کتابوں کا انعام پائیں۔

انسپکٹر نادر اپنی گاڑی پر آبادی سے بہت دور ایک ویران علاقے میں جا رہے تھے۔ شام کا وقت تھا اور اندھیرا بھی ہو رہا تھا۔ اتنے میں اچانک ٹائر پنکچر ہو گیا۔ انسپکٹر نے جلدی سے گاڑی روکی اور ٹائر اتارنے لگے۔ یہ سارا علاقہ جرائم پیشہ لوگوں کا تھا۔ خطرہ تھا کہ اگر وہ ایک ٹائر پنکچر لگوانے کے لیے لے کر گئے تو چور اپنی گاڑی کا فالتو ٹائر لگا کر ان کی گاڑی چرا لے جائیں گے۔ ایسے میں انہوں نے اینٹوں سے بھرا ہوا ایک ٹریکٹر دور کھڑا دیکھا۔ اسے دیکھتے ہی انہیں ایک ترکیب سوجھی جس سے انہوں نے اپنے مسئلے کا حل نکال لیا۔ تصویر دیکھ کر بتایئے کہ انہوں نے اپنا مسئلہ کس طرح حل کیا؟

ہر حل کے ساتھ کوپن بھیجنا ضروری ہے۔ جواب بھیجنے کی آخری تاریخ 10 جون 2005ء

کھوج لگائیے!

نام: _____

پورا پتا: _____

_____

_____

_____

اپریل 2005ء میں شائع ہونے والے "کھوج لگائیے!" کا صحیح حل: رشید خود تو تیرنا نہیں جانتا تھا۔ پریشانی کے عالم میں اس نے ادھر ادھر دیکھا تو اسے کچھ فاصلے پر پنکچر والے کی دکان پر ٹائر ٹیوب نظر آئے۔ وہ بھاگا ہوا گیا اور دکان سے ایک ٹیوب اٹھا لایا اور پھر اسے جلدی سے نہر میں اپنے دوست انور کی طرف پھینکا۔ اس طرح انور نے ٹیوب کی مدد سے تیر کر اپنی جان بچائی۔

(1) خواجہ محمد حسنین، ملتان (2) سرمد اکرام، لاہور (3) محمد بلال ظفر، راولپنڈی (4) دانش رضا بخاری، ڈیرہ اسماعیل خان (5) ایاز احمد کھوکھر، گڈو (6) فرحان ادریس کراچی (7) محمد شعیب اقبال، فیصل آباد (8) صاعقہ ولایت کھاریاں کینٹ (9) روحیہ عرفان، سیالکوٹ (10) انس عدنان سکھر۔

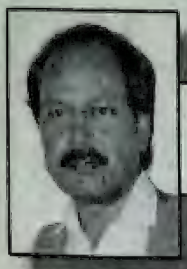

ضیاء الحسن ضیاء

بچوں کے ممتاز شاعر اور کراچی کے علمی و ادبی حلقوں کا ایک معتبر نام۔ ایک مدت سے "تعلیم و تربیت" کے لئے قارئین کے لیے مزے مزے کی نظمیں تخلیق کر رہے ہیں۔

بہت ہی کم

غائب جو مدرسے سے رہا، کم بہت ہی کم
مرغا وہ مدرسے میں بنا، کم بہت ہی کم

اُستاد جس سے کرتے رہے مدرسے میں پیار
گھر میں بھی اس نے پائی سزا، کم بہت ہی کم

استاد کے طمانچے نے بہرا بنا دیا
اک کان سے ہمیشہ سُنا، کم بہت ہی کم

اس کا بھی ساری دنیا میں ہو گا نہ کچھ بھلا
چاہے جو دوسروں کا بھلا، کم بہت ہی کم

دینا پڑیں نہ پیسے بھتیجوں کو، اس لیے
آتے ہیں میرے گھر میں چچا، کم بہت ہی کم

بلی کو دیکھا تاک میں چوہے کی ہر گھڑی
بلی کے پیچھے چوہا ملا، کم بہت ہی کم

ممّی کا لاڈلا ہوں میں، اس اعتبار سے
ہوتے ہیں مجھ سے ڈیڈی خفا، کم بہت ہی کم

کھانے نہ کھائے چٹپٹے جس نے کبھی ضیاؔ
لایا وہ ڈاکٹر سے دوا، کم بہت ہی کم

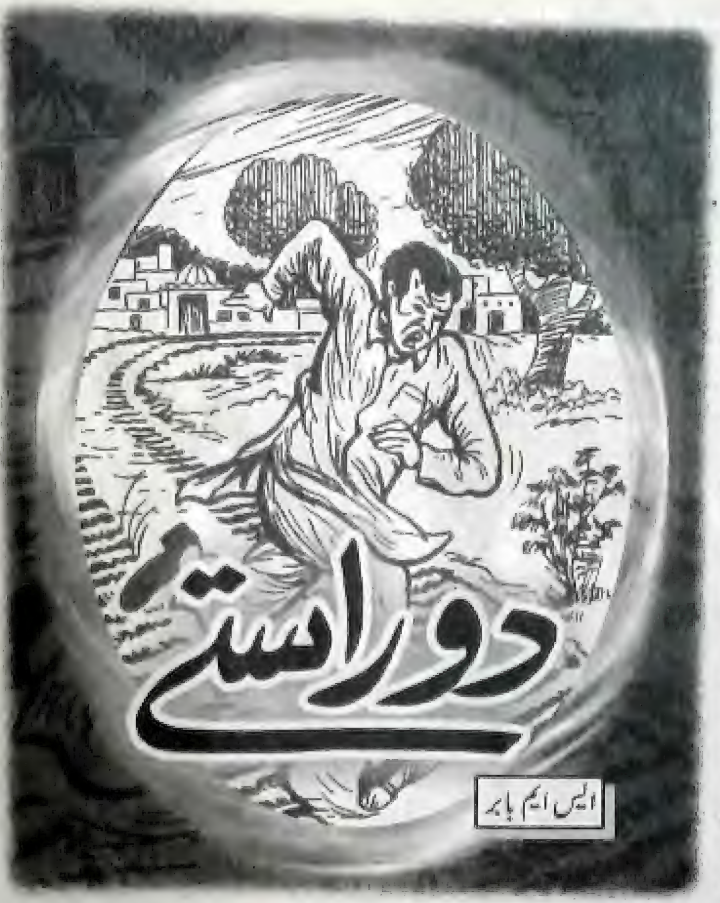

اس کی عمر پندرہ سال' قد لمبا اور جسم گٹھا ہوا تھا۔ نام تو اس کا سکندر تھا لیکن سب اسے سکندرا کہتے تھے۔ وہ بھاگ رہا تھا اسے کوئی پتا نہیں تھا کہ اردگرد کیا ہو رہا ہے۔ اس کے پاؤں میں جوتا بھی نہیں تھا۔ سڑک کچی تھی۔ ٹریکٹر ٹرالیوں نے گزر گزر کر سڑک کے درمیان دو نالیاں سی بنا دی تھیں۔ وہ ان دو نالیوں کے درمیان میں بھاگتا چلا جا رہا تھا۔ آگے راستے میں ایک نالا آگیا جس پر پل نہیں تھا۔ پانی کناروں تک بہہ رہا تھا۔ وہ نالے کے کنارے کنارے چل کر اس طرف بڑھنے لگا جہاں سے نالا ذرا کم چوڑا تھا تاکہ وہاں سے چھلانگ لگا کر نالا پار کر لے۔ لیکن اس سے پہلے ایک اور آدمی بھی سڑک چھوڑ کر نالے کے کنارے پر ہو لیا تھا۔ وہ سست رفتار تھا اور راستہ تنگ۔ سکندر کا دل چاہا کہ اسے اٹھا کر نالے میں پھینک دے کیونکہ اسے بہت جلدی تھی لیکن وہ ایسا نہ کر سکا اور آہستہ آہستہ اس کے پیچھے چلنے لگا۔

"چچا مجھے رستہ دو' مجھے ذرا جلدی ہے؟" بالآخر سکندر نے کہہ ہی دیا۔

"چل تو رہا ہوں۔ کیا جلدی ہے تمہیں؟" وہ آدمی خفگی سے بولا۔

"میرا باپ بہت بیمار ہے۔ گھر میں اکیلا ہے' میں نور کے گاؤں حکیم دین محمد کو لینے جا رہا ہوں"۔

وہ شخص چلنے کے بجائے کھڑا ہو گیا اور پیچھے مڑ کر لڑکے کی طرف دیکھتے ہوئے تلخی سے بولا:

"بندہ بیمار ہو ہی جاتا ہے۔ اگر تمہارے باپ کی موت ہی لکھی ہے تو کیا حکیم دین محمد اسے بچا لے گا؟"

اب سے تھوڑی دیر پہلے کچھ ایسی ہی باتیں نمبردار نے بھی کی تھیں۔ جب وہ اس کے آگے فریاد کر رہا تھا کہ اس کا باپ مر رہا ہے' وہ اس کے لیے کچھ کرے۔ کسی گھوڑے کا انتظام کر دے تاکہ وہ دوسرے گاؤں سے حکیم دین محمد کو لے آئے۔ نمبردار نے جواب میں کہا تھا: تیرا بابا فتح محمد کھانس کھانس کر بہت کمزور ہو چکا ہے۔ حکیم دین محمد بے چارہ کیا کرے گا۔ تم اس کے لیے گھر میں بیٹھ کر دعا کرو۔ یہ سن کر سکندر کا دل چاہتا تھا کہ وہ نمبردار کے منہ پر اتنے گھونسے مارے کہ اس کی شکل بگڑ جائے۔ وہ ایسا کر بھی سکتا تھا۔ اس سے کسی بھی کام کی توقع کی جا سکتی تھی۔ لیکن ایسا کرنے کے لیے اس کے پاس وقت نہیں تھا۔ اس نے یہ کام کسی اور وقت کے لیے چھوڑا اور خود سڑک پر دوڑ لگا دی۔

دراصل پورے علاقے میں سوائے حکیم دین محمد کے اور کوئی حکیم یا ڈاکٹر تھا ہی نہیں۔ لوگ جب بھی بیمار ہوتے حکیم دین محمد کی طرف ہی بھاگتے تھے۔ آج صبح جب اس کا باپ کھانس کھانس کر بے حال ہو کر گر گیا تو اس نے بھاگ کر ہمسائے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ ہمسائے نے آکر بابے فتح محمد کو دیکھا اور ہلا جلا کر کہنے لگا: یہ مرا نہیں' ابھی بے ہوش ہے۔ سکندرے! تم دوڑ کر رحمو کو بلا لاؤ۔ اس کے پاس ٹوٹکے ہوتے ہیں۔ سکندر رحمو کے پاس پہنچا تو رحمو نے نہایت خشک جواب دیا کہ اس کے پاس فتح محمد کا کوئی علاج نہیں۔ سکندر مایوس ہو کر واپس لوٹا تو ہمسائے نے اسے نمبردار کی طرف بھجوا دیا۔ نمبردار کے صاف جواب دینے پر اس نے حکیم دین محمد کی طرف پیدل ہی دوڑ لگا دی۔

"میرا باپ مر رہا ہے۔ میرا حکیم تک جلد پہنچنا نہایت ضروری ہے۔ آپ میرا راستہ چھوڑ دیں"۔ سکندر نے ذرا تلخی سے کہا۔

"نہیں چھوڑتا۔ کیا کرو گے تم؟"

سکندر کا دماغ پہلے ہی ماؤف تھا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اس آدمی کو ٹانگوں سے پکڑ کر اٹھایا اور نالے میں پھینک دیا۔ "غڑاپ" کی آواز آئی اور وہ آدمی نالے میں ڈبکیاں لینے لگا۔ سکندر نے نالا پار کیا اور سڑک پر پھر دوڑ لگا دی۔

"حکیم صاحب میرا اس دنیا میں صرف باپ ہی ہے۔ اسے اگر کچھ ہوگیا تو میں اس دنیا میں اکیلا رہ جاؤں گا۔ خدا کے لیے چلیں اور اسے دیکھیں"۔ سکندر نے حکیم دین محمد کے سامنے التجا کی۔

حکیم دین محمد نے اپنی حویلی سے گھوڑا منگوایا اور سکندر کو اپنے پیچھے بٹھا لیا۔

وہ گھر پہنچے تو اس کے باپ کی چارپائی کے اردگرد دو تین ہمسائے' عورتیں اور مرد سر جھکائے خاموش بیٹھے تھے۔ بابا فتح محمد کے اوپر ایک سفید چادر اوڑھا دی گئی تھی۔ حکیم دین محمد نے آگے بڑھ کر چادر ہٹائی اور بابا فتح محمد کو ہلا جلا کر دیکھا۔

"بیٹا! تمہارا باپ اب اس دنیا میں نہیں رہا۔ خدائی حکم کے آگے ہر کسی کو سر تسلیم خم کرنا پڑتا ہے صبر کرو۔ اس کے لیے مغفرت کی دعا کرو"۔ حکیم دین محمد نے سکندر کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ وہ سکندر جس نے آج تک رونا سیکھا ہی نہیں تھا' دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

اپنے باپ کی تجہیز و تلفین کے بعد سکندر گھر واپس آیا تو بہت ہی غم زدہ تھا۔ اس کے آنسو رکنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ وہ صحن میں بچھی ہوئی چارپائی پر بیٹھ کر نہایت حسرت سے اپنے ویران مکان کو دیکھنے لگا جہاں اب اسے لاڈ پیار کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ نیم کے درخت کے ساتھ بندھی ہوئی بکری سکندر کو دیکھ کر ممیا رہی تھی۔ دن بھر میں سکندر کے لیے بس ایک ہی کام تھا کہ تھوڑا سا اُسے چارہ بکری کے لیے لانا ہوتا تھا۔ اسی بکری کا آدھا آدھا دودھ دونوں باپ بیٹا پیتے تھے اور خدا کا شکر ادا کرتے تھے۔ آج سکندر بکری کے لیے گھاس بھی نہیں لا سکا تھا۔

سکندر سوچ رہا تھا کہ اب اس دنیا میں کون ہے جو اسے سہارا دے گا؟ ماں پہلے ہی مر چکی تھی۔ اب باپ بھی چلتا بنا۔ کوئی رشتہ دار بھی تو نہیں۔ اس گاؤں میں اسے کون اچھا سمجھتا تھا۔ اس نے گاؤں میں تقریباً ہر آدمی سے دنگا فساد کیا تھا اور نمبردار سے

جو شخص اپنے آپ پر فتح حاصل کر لے اس کے لیے دوسروں پر فتح حاصل کرنا کچھ مشکل نہیں!

گالیاں اور اپنے باپ سے جھڑکیاں کھائی تھیں۔ لکھائی پڑھائی سے اس کا دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ اس کے باپ نے کسی وقت بڑے شوق سے اپنے بیٹے کو گاؤں کے اسکول میں داخل کروایا تھا۔ لیکن دو جماعتوں کے بعد استاد نے یہ کہہ کر اپنے ہاتھ اٹھا لیے تھے کہ یہ شریر لڑکا کبھی بھی نہیں پڑھ سکتا بلکہ دوسروں کے لیے بھی وبال جان بنا رہے گا۔ اس نے سوچا: "اگر گاؤں میں کسی نے اسے اپنے پاس رکھ بھی لیا تو وہ نوکروں کی طرح اس سے کام لے گا اور پھر دے گا بھی کیا' صرف دو وقت کی روٹی! اس کا یہ گھر گاؤں کے نمبردار کا تھا۔ اگر اس نے نمبردار کی غلامی قبول نہ کی تو وہ اس سے یہ مکان بھی خالی کروا سکتا ہے۔ اگر وہ اس گھر میں رہتا ہے تو کھائے گا کہاں سے؟" بکری ایک بار پھر ممیائی تو سکندر گھاس لانے کے لیے ایک چادر اور درانتی لے کر باہر نکل گیا۔

"میں اپنے باپ کی موت کا انتقام سب لوگوں سے لوں گا"۔ اس نے درانتی کو زور سے اس طرح گھاس پر مارا جیسے وہ معاشرے کا سر کاٹ رہا ہو۔ "لیکن اس مقصد کے لیے مجھے ہتھیار کی ضرورت پڑے گی"۔ پستول کی پیش کش تو اسے ولائت نے چند دن بیشتر کی تھی لیکن اس نے پیسے بہت مانگے تھے۔ "کیوں نہ ہتھیار لینے کے لیے بکری بیچ دوں؟" سکندر نے سوچا اور گھاس کو چادر میں ڈال کر کمر پر لٹکا لیا۔

اگلے روز وہ بکری لیے رحمو کے پاس کھڑا تھا۔

"صرف سو روپے؟" سکندر نے حیرت زدہ ہو کر کہا "کیا میں کوئی چڑیا بیچ رہا ہوں؟"

"تم نے پیسے کرنے کیا ہیں؟ ادھر ادھر فضول اڑا دو گے اور ہاں کوئی تمہیں اس سے زیادہ پیسے دے گا بھی نہیں"۔ رحمو نے سر کو جھٹکتے ہوئے کہا۔

سکندر نے سوچا گاؤں میں چونکہ سب لوگ اسے جانتے ہیں اس لیے کوئی بھی بکری کی زیادہ قیمت نہیں دے گا۔ بکری کو کسی اور گاؤں میں جا کر بیچنا چاہیے۔ اس نے بکری کی رسی پکڑی اور

ساتھ والے گاؤں میں بیچنے کے لیے چل پڑا۔

"کیا یہ بکری چوری کی ہے؟" ایک آدمی نے سکندر کو گھور کر دیکھا۔

"یہ بکری چوری کی نہیں' میری اپنی ہے تم اس کی تصدیق میرے گاؤں کے نمبردار سے بھی کر سکتے ہو"۔

"اوہ ہو بھئی' میں تو مذاق کر رہا تھا۔ تم اگر چوری کی بکری بھی لے آؤ تو کوئی بات نہیں۔ میں وہ بھی خرید لوں گا"۔ آدمی نے ہنستے ہوئے کہا۔

"پھر کتنے پیسے دیتے ہو؟"

"ایک ہزار سے اوپر ایک پائی نہیں" آدمی نے حتمی انداز میں کہا۔

"لیکن پستول خریدنے کے لیے تو مجھے زیادہ روپوں کی ضرورت ہے"۔ سکندر نے دل ہی دل میں سوچا۔ "پھر یہ سب کیسے ہو گا؟"

"کس سوچ میں پڑ گئے ہو۔ یہ لو ایک ہزار روپیہ اور بکری دو مجھے!" آدمی نے سکندر کو سوچ میں گم دیکھ کر کہا۔

"ہمارے پاس بہت سی بکریاں ہیں۔ میں جب بھی کوئی بکری لاؤں تو کیا تم اسی وقت نقد خرید لو گے؟" سکندر نے تصدیق کرنا چاہی۔

"ہاں بھئی' میں تو اپنے جانور قصائیوں کو بیچتا ہوں۔ جب تمہارا دل چاہے' لے آؤ" آدمی نے معنی خیز نظروں سے سکندر کو دیکھتے ہوئے کہا۔ سکندر نے اس کی نظروں کا مطلب سمجھتے ہوئے سر جھکا لیا اور ہزار کا نوٹ پکڑ کر جیب میں ڈال لیا۔

وہ رات سکندر کے لیے بہت بھاری تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے وہ کوئی بھوت ہو اور کسی انسان کا خون چوسنے کے لیے رات کے اندھیرے میں گھر سے باہر نکلا ہو۔ منزل اس نے پہلے متعین کر لی تھی۔ آبادی سے ہٹ کر یہ ایک ڈیرا تھا جس کے مالک "حافظ جی" کا علاقے میں بہت احترام تھا..... مگر سکندر نے وہاں سے دبے پاؤں ایک بکری چرا لی۔ یہ بکری بھی اس بیوپاری نے ایک ہزار روپے میں خرید لی۔

سکندر کو اس سے کچھ حوصلہ ہوا کہ کسی کو کان وکان خبر نہ ہوئی ہے۔ گاؤں میں شور ضرور مچا تھا کہ حافظ جی کے ڈیرے سے

بکری چوری ہوگئی ہے۔ اگلے دو دن اس نے نہایت خاموشی سے گزار دیے۔ کھانا اسے ہمسائے دیتے تھے۔ ہمسائیوں نے اس کے باپ کی وفات کے بعد اس دن تک اس کو کھانا بھیجنے کا وعدہ کیا تھا۔ ایک دن کھانا نمبردار کی طرف سے بھی آیا تھا۔ نمبردار نے اس کے گھر آکر اسے کوئی کام کاج کرنے کا مشورہ بھی دیا تھا۔

صرف ایک دن میں ہزار روپیہ پاکر سکندر بہت خوش تھا۔ اس نے سوچا' سب کاموں سے بہتر کام تو یہی ہے اور یہی وہ کام ہے جس سے وہ بہت پیسے جمع کر سکتا ہے۔ دو دن آرام کے بعد ایک رات پھر سکندر گھر سے نکلا۔ اس نے کالا سا کپڑا اپنے منہ پر لپیٹ لیا تاکہ پہچانا نہ جاسکے۔ آج اس کی منزل گاموں لوہار کا گھر تھا۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ اگر اسے کوئی ڈر تھا تو گاموں لوہار کے بیٹے سے تھا۔ وہ بھی لڑائی بھڑائی میں تیز تھا۔ تاہم وہ چپکے چپکے آگے بڑھتا رہا۔ گاموں کے گھر پہنچ کر اس نے بیرونی دیوار پھلانگی اور ایک موٹا تازہ بکرا کھول کر دروازے کی طرف لوٹا۔ دروازے کے کھٹکے سے گاموں کا بیٹا جاگ اٹھا اور ڈنڈا اٹھا کر اس پر پل پڑا۔ سکندر نے اس سے ڈنڈا چھین کر اس کے سر پر مارا اور اسے بے ہوش کر کے نکل گیا۔

یہ بکرا سکندر نے دو ہزار روپے میں بیچا۔ لیکن اب وہ کچھ زیادہ محتاط ہو گیا تھا۔ اس نے سوچا کہ اب وہ اپنے گاؤں کے بجائے کسی دوسرے گاؤں میں جا کر چوری کرے گا۔

اب اس کا کام تھا کہ سارا دن آرام کرتا اور رات کو نکل کھڑا ہوتا۔ پستول اس نے لے لیا تھا۔ رات کو چوری پر نکلتے وقت وہ پستول اپنے پاس رکھتا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ وہ ایک منجھا ہوا چور بن گیا۔ اب بکریاں چوری کرنا اس کے لیے بالکل ایسے تھا کہ جیسے کسی باغ سے پھل توڑنا۔

بالآخر اس کی زندگی کی ایک اہم رات آپہنچی۔ وہ پستول اپنی قمیض کے اندر اڑس کر رات کو دو بجے باہر نکلا۔ آج اس کی منزل دو گاؤں چھوڑ کر تیسرا گاؤں تھا۔ آج اس نے ایک قیمتی بکری چرانا تھی جس کا مالک ایک کمہار تھا۔ اس نے گدھوں کے ساتھ بکریاں بھی پال رکھی تھیں۔ وہ سارا دن کام کرتا اور رات کو کھانا کھاتے ہی بے سدھ پڑ کر سو رہتا تھا۔ گھر میں صرف یہی ایک مرد تھا۔

ایس ایم بابر

سنسنی خیز اور پراسرار کہانیوں کے ممتاز اور ہر دلعزیز تخلیق کار۔ ایک نفیس' پرخلوص اور کتاب دوست شخصیت جن کی تحریریں بچے اور بڑے شوق سے پڑھتے ہیں۔

اس لیے کسی تشویش کی بات نہیں تھی۔ سکندر نے دیوار پھلانگی اور جانوروں کے باڑے کی طرف بڑھا۔ ایک بکری کی رسی کھول کر وہ سیدھا ہوا ہی تھا کہ پیچھے سے ایک نہایت شستہ آواز آئی۔ "تمہارا کیا نام ہے بیٹا؟"

سکندر نے گھبرا کر پیچھے دیکھا۔ ایک نہایت بارعب شخصیت اس کے پیچھے کھڑی تھی۔ صاف ستھرا لباس' آنکھوں پر چشمہ' تیز پر اعتماد نظریں' چہرے پر اطمینان اور وقار' سکندر نے پستول نکالنے کے لیے ہاتھ بڑھانا چاہا لیکن وہ کوشش کے باوجود ایسا نہ کر سکا۔

"میرا نام سکندر ہے۔ سب لوگ مجھے سکندرا کہتے ہیں"۔ سکندر نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

"میرے پیچھے آؤ میرے بچے!" وہ سکندر کی طرف دیکھے بغیر نہایت شفقت اور وقار سے بولا۔ پھر مڑا اور آگے بڑھتا چلا گیا۔ یہ ایک سنہری موقع تھا۔ سکندر پشت سے وار کر سکتا تھا لیکن وہ تو جیسے اس کے تابع ہو گیا تھا۔ کمرے میں پہنچ کر سکندر نے دیکھا کہ ایک چارپائی بچھی ہے۔ لالٹین جل رہی ہے اور دو تین کتابیں بستر پر پڑی ہیں۔ اس آدمی نے کتابیں ایک طرف ہٹائیں اور سکندر کو بیٹھنے کے لیے کہا۔ وہ خود بھی چارپائی پر ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔

"میں پیشے کے اعتبار سے وکیل ہوں اور اس گھر میں مہمان ہوں۔ یہ لوگ بدقسمتی سے ایک بار کسی ناکردہ جرم میں تھانے پہنچ گئے تھے۔ میں نے ان معصوم لوگوں کو مصیبت سے

چھوٹکارا دلایا۔ وہ اتنے احسان مند ہوئے کہ مجھ سے وعدہ لیا کہ میں کسی روز ان کے گاؤں ضرور آؤں۔ کل مجھے فرصت تھی۔ سوچا ان کی خواہش پوری کر ہی دوں۔ میری گاڑی ڈیرے پر کھڑی ہے۔ اب تم اپنے بارے میں مجھے کچھ بتاؤ"۔

سکندر نے بغیر کسی جھجک کے اپنی مختصر سی زندگی وکیل صاحب کے سامنے کھول کر رکھ دی۔

"تم نے اپنی زندگی کے لیے جس راستے کا انتخاب کیا ہے' وہ غلط ہے۔ جب بھی ایسی صورت حال ہو انسان کے سامنے ہمیشہ دو راستے ہوتے ہیں۔ ایک بھلائی کا راستہ اور ایک برائی کا راستہ۔ جو راستہ برائی کی طرف جاتا ہے اس کی منزل تباہی اور بربادی ہے۔ یہاں پر انسان کو بے چینی اور پریشانی ہی ملتی ہے۔ جب کہ بھلائی کی طرف جانے والا راستہ ہمیشہ انسان کو ایسی منزل تک پہنچاتا ہے جہاں سکون اور اطمینان اس کا منتظر ہوتا ہے"۔

"لیکن میں تو اس ظالم معاشرے سے انتقام لینا چاہتا ہوں' جس نے میرا باپ مجھ سے چھین لیا"۔ سکندر نے تیز آواز میں کہا۔

"معاشرے سے انتقام کا ایک دوسرا طریقہ بھی تھا۔ تم بکری بیچ کر چپ چاپ شہر کا رخ کرتے' وہاں روزگار کے کئی مواقع ہوتے ہیں۔ کسی ورکشاپ پر ملازم ہو جاتے اور فارغ وقت میں پڑھتے۔ اس طرح ایک اچھا شہری بن کر تم اس جہالت اور ظلم سے انتقام لے سکتے تھے"۔

"یہ بات تو میرے دماغ میں نہیں آئی"۔

"میں تمہیں ایک پیش کش کرتا ہوں۔ تم ایسا کرو' میرے ساتھ شہر چلو۔ میں تمہیں اپنے دفتر میں آفس بوائے رکھ لیتا ہوں۔ میں اکثر عدالت میں مصروف ہوتا ہوں۔ ان اوقات میں میرا منشی تمہیں پڑھا دیا کرے گا۔ مجھے اُمید ہے تم ایک اچھا شہری بننے میں کامیاب ہو جاؤ گے۔ لیکن اس کی ایک شرط ہے"۔

"وہ کیا؟" سکندر نے کہا جو وکیل صاحب کی باتیں سن کر اپنے آپ کو تبدیل کرنے کا دل ہی دل میں تہیہ کر چکا تھا۔

"تمہیں سچے دل کے ساتھ برائی سے توبہ کرنی ہو گی"۔ وکیل صاحب نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

"میں سچے دل کے ساتھ توبہ کرتا ہوں۔ میں آئندہ کبھی چوری نہیں کروں گا اور اپنے آپ کو بھلائی کے راستے پر چلاؤں گا"۔ سکندر کے لہجے میں ایسا یقین تھا کہ وکیل صاحب کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

سکندر پڑھ لکھ کر ایک اچھا انسان بنا۔ اس نے مختلف تنظیموں سے مل کر اپنے علاقے میں اسکول اور ہسپتال بنائے اور اس طرح جہالت کے اندھیرے دور کر کے اپنا انتقام لے لیا۔

☆☆☆☆☆☆

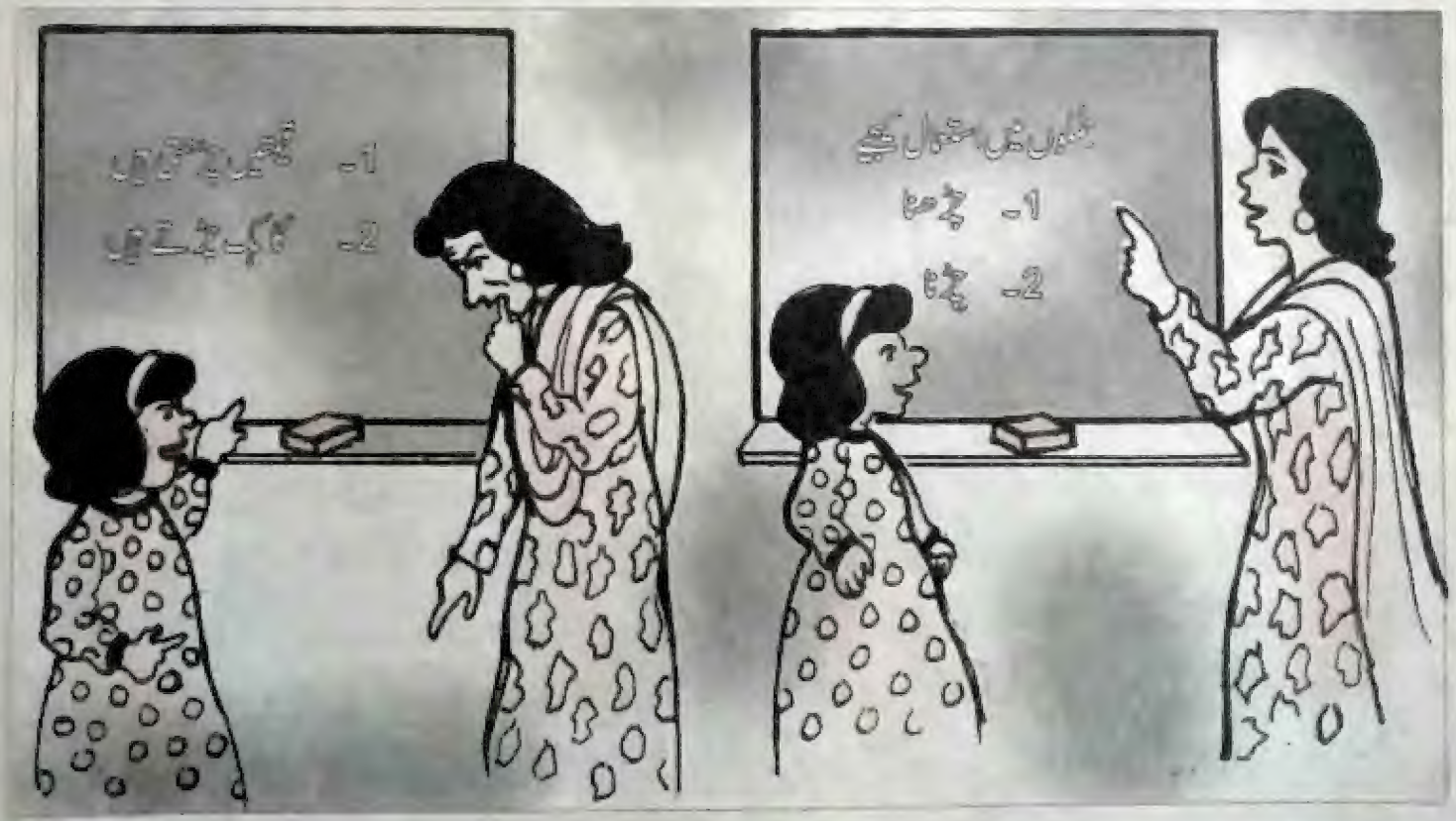

"میں ہوں چلی' دنیا کا طاقت ور ترین چوہا!"

ننھے چلی نے اپنے بل سے نکل کر نعرہ لگایا اور ورزش کے لیے قلابازیاں لگانے لگے۔ وہ ہر وقت بنیان اور نیکر پہنے رہتا تھا۔ تھا تو وہ ننھا سا چوہا مگر اس کو بڑا بننے کا بہت شوق تھا۔ روزانہ صبح سویرے ورزش کرتا اور جنگل میں لمبی دوڑ لگاتا تاکہ اس کے پٹھے مضبوط ہوں۔ کبھی کبھی وہ اپنے پٹھوں کی مضبوطی دکھانے کے لیے ہاتھ سے اخروٹ توڑنے کا مظاہرہ بھی کرتا جس میں اکثر وہ ناکام ہی رہتا۔ تاہم جنگل کا کوئی جانور اس کی حرکتوں کا برا نہیں مانتا تھا کیونکہ اس نے کبھی کسی کو تنگ نہیں کیا تھا۔

ایک روز وہ جنگل میں جوگنگ کرتا ہوا جا رہا تھا کہ تالاب کے پاس سے گزرا۔ تالاب میں بیٹھے مینڈکوں پر نظر پڑتے ہی وہ چلایا۔ "جاگو' جاگو کاہل لوگو! ورزش کیا کرو۔ مضبوط بنو مضبوط!"

ایک مینڈک نے بولنے کے لیے ابھی منہ کھولا ہی تھا کہ چلی اس کی بات سنے بغیر آگے نکل گیا۔

اب وہ خرگوشوں کی کھوہ کے پاس سے گزرا۔

"جاگو' جاگو کاہل لوگو! ورزش کیا کرو" چلی چلایا اور ڈنڈ بیٹھکیں لگانے لگا۔ جونہی وہ بیٹھک لگانے کے لیے جھکا ایک گاجر اس کی پیٹھ پر لگی اور وہ منہ کے بل گر پڑا۔ کھوہ کے اندر سے خرگوشوں کے ہنسنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ انہوں نے ہی یہ شرارت کی تھی۔ چلی مٹی جھاڑتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ خرگوش بھی کھوہ سے باہر نکل آئے۔

کیوں' کیسی رہی ورزش؟ ایک خرگوش نے مسکراتے ہوئے کہا اور سارے خرگوش ہنسنے لگے۔

چلی کو بہت غصہ آیا' وہ بولا: "تمہیں میری طاقت کا اندازہ نہیں' میں تم سب کو پچھاڑ سکتا ہوں"۔

"اچھا! تم اتنے طاقت ور ہو' سب کو پچھاڑ سکتے ہو؟" ایک خرگوش نے شرارت سے آنکھیں پھیلاتے ہوئے کہا۔

"ہاں' کیوں نہیں" چلی غصے سے بے قابو ہو رہا تھا۔

"کسی کو بھی؟"

"ہاں کسی کو بھی!"

"ٹھیک ہے پھر تم اس بوڑھے برگد کو پچھاڑ کر دکھاؤ۔ خرگوش نے شرارت سے کہا۔ وہ چلی کو بے وقوف بنا کر اس کا تماشا دیکھنا چاہتا تھا۔

چلی نے فوراً چیلنج قبول کرتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے مجھے منظور ہے۔ مگر یہ مقابلہ کل ہو گا تاکہ جنگل کے تمام جانور میری طاقت کا مظاہرہ دیکھ لیں"۔

"تو پھر ٹھیک ہے کل تیاری کر کے آنا" خرگوش نے کہا اور ہنستے ہوئے بھاگ گئے تاکہ سب جانوروں کو مقابلے کا بتا سکیں۔

چلی گھر پہنچا تو اس کا غصہ اتر چکا تھا۔ اب اس نے ٹھنڈے دماغ سے کل کے متعلق سوچنا شروع کیا۔

"یہ میں نے کیا کیا! میں اتنے بڑے برگد کو کیسے ہلا پاؤں گا؟"

چلی کو اپنے فیصلے پر پچھتاوا ہو رہا تھا۔ سچ کہتے ہیں' غصہ عقل کو کھا جاتا ہے اور انسان غصے میں غلط فیصلے کر بیٹھتا ہے۔ یہی کچھ چلی کے ساتھ ہوا تھا۔ غصے میں آکر اس نے چیلنج قبول تو کر لیا تھا مگر اب جان پر بن گئی تھی۔

"کچھ نہ کچھ تو کرنا پڑے گا۔ اگر مقابلہ ہار گیا تو جنگل بھر میں بے عزتی ہو جائے گی۔ یہ مجھ سے برداشت نہ ہو گا"۔ چلی نے سوچا اور منصوبہ بندی کرنے لگا۔

اگلے روز بہت جلد اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے آج معمول سے زیادہ ورزش کی۔ بازوؤں اور ٹانگوں پر سرسوں کے تیل کی مالش کی' ایک بڑا گلاس دودھ کا پیا اور پوری ایک پیالی مکھن کی کھا گیا۔ توانائی تو اس کو بہت ملی مگر اس کا دل مطمئن نہیں ہو رہا تھا۔ وہ کمرے میں ادھر سے ادھر ٹہلنے لگا۔ اچانک اس کی نظر کپڑوں کے صندوق پر پڑی۔

"چی..... لی" چلی نے زور دار نعرہ لگایا کیونکہ اس کو ایک ترکیب سوجھ گئی تھی۔ وہ جب کبھی جوش میں آتا "چی..... لی" کا نعرہ لگایا کرتا تھا۔ پیٹی پر چڑھ کر اس نے صندوق کھولا اور سارے کپڑے باہر نکال کر رکھ دیئے۔ اب اس نے اپنے پاجاموں اور نیکروں کے الاسٹک نکالنے شروع کر دیئے۔ حتیٰ کہ اس نے اپنے تمام بھائیوں کے پاجاموں کے الاسٹک بھی نکال لیے۔ اب اس نے الاسٹک کو گرہیں باندھ باندھ کر لمبی رسی بنالی۔

"یہ ہوئی نا بات!" چلی نے اپنی ترکیب مکمل ہونے پر خوش ہو کر کہا۔

خرگوشوں نے تمام جانوروں کو مقابلے کے متعلق بتا دیا تھا۔ چنانچہ دوپہر تک برگد کے پاس تمام جنگل اکٹھا ہو چکا تھا۔ ایک میلے کا سماں تھا۔ جانوروں نے شور مچا مچا کر آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا۔ لومڑیاں ہاتھوں میں ڈنڈے پکڑے ہجوم کو کنٹرول کر رہی تھیں۔

آخر مقابلے کا وقت آن پہنچا۔ ایک بڑے سانپ کو منصف مقرر کیا گیا۔ چلی برگد کے گرد اپنی رسی ڈال کر کھڑا ہو گیا تاکہ درخت کو کھینچ سکے۔ تب منصف نے چلی کے پیچھے تھوڑے فاصلے پر ایک لکیر کھینچ کر اعلان کیا: "اگر چلی درخت کو کھینچتا ہوا اس لکیر تک پہنچ گیا تو اس کا مطلب ہو گا کہ چلی مقابلہ جیت گیا۔ اگر وہ لکیر تک نہ پہنچ سکا تو وہ مقابلہ ہار جائے گا اور سب کو معلوم ہو جائے گا کہ چلی دنیا کا سب سے طاقت ور چوہا نہیں"۔

مجمع پر خاموشی طاری ہو گئی۔ مقابلے کے آغاز کا اعلان ہوا۔ "ایک..... دو..... تین شروع" مقابلہ شروع ہوا۔ چلی نے آنکھیں بند کر کے ہونٹوں کو بھینچا اور یوں ظاہر کرنے لگا جیسے بہت زور لگا رہا ہو مگر وہ کر کچھ بھی نہیں رہا تھا۔ چند منٹ یونہی گزر گئے۔ چلی ایک انچ بھی لکیر کی طرف نہیں بڑھا تھا۔ لگتا تھا وہ ہار جائے گا۔ جانور چلانے لگے: "زور لگاؤ چلی! کھینچو اور کھینچو"۔

مگر چلی بڑا چالاک تھا۔ وہ دل میں کہنے لگا: "تم لوگ سمجھ رہے ہو میرے ہاتھ میں رسی ہے مگر یہ تو الاسٹک ہے۔ میں جب چاہوں گا پیچھے ہٹتا ہوا لکیر تک پہنچ جاؤں گا"۔

وہ پھر سے زور لگانے کی اداکاری کرنے لگا۔ خرگوش چلی کو ہارتا دیکھ کر قہقہے لگا رہے تھے۔ تب اچانک چلی نے نعرہ لگایا "چی..... لی!" اور آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگا۔ بالکل آہستہ آہستہ اور آخرکار لکیر پار کر گیا۔

چلی کے دوست خوشی سے نعرے لگانے لگے۔ انہوں نے چلی کو کاندھوں پر اٹھا کر بھنگڑا ڈالنا شروع کر دیا۔ موٹا بھالو زور زور سے ڈھول بجانے لگا۔ سب کہہ رہے تھے: "واقعی چلی دنیا کا سب سے طاقت ور چوہا ہے"۔ مگر انہیں کیا پتا؟ یہ تو معاملہ ہی کچھ اور تھا۔

☆☆☆☆☆☆

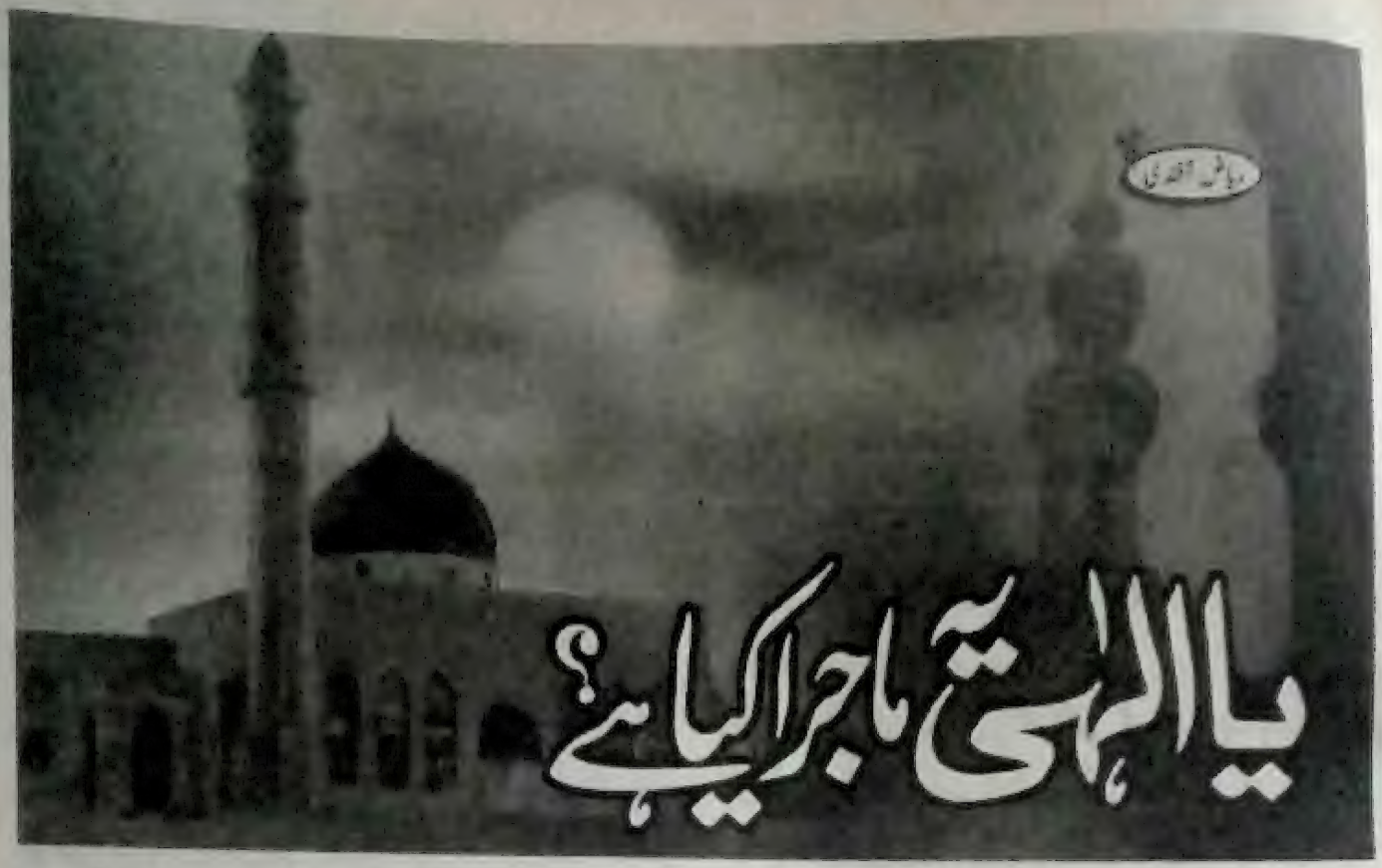

یاالٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟

پیارے بچو...... آج آپ کو ایسا دلچسپ تاریخی واقعہ سنا رہے ہیں جسے پڑھ کر نہ صرف جی خوش ہو گا بلکہ سبق بھی ملے گا کہ اگر انسان مشکل سے نکلنے کے لیے محنت' لگن' سکون اور صبر سے کوشش کرے تو اللہ اس کی مشکل ضرور آسان کرتا ہے۔

تو پیارے بچو' آؤ...... میرے ساتھ آؤ ہم ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور آج سے لگ بھگ سات سو' ساڑھے سات سو سال پیچھے کی طرف جاتے ہیں' تاکہ تاریخ کے جھروکوں سے دہلی کی سیر کریں۔ دیکھو! یہ رہا شہر دہلی' جسے ہندوستان کا دل کہا جاتا ہے۔ ہاں یہ وہی شہر ہے جو کئی بار اجڑا اور کئی بار بسا۔ دیکھو دیکھو' یہ رہا لال قلعہ' یہ رہی جامع مسجد' یہ رہا ہمایوں بادشاہ کا مقبرہ' یہ رہا قطب مینار' یہ پرانی تاریخی عمارتیں اس بات کی گواہ ہیں کہ یہ شہر کئی سو سال تک مسلم حکمرانوں کا پایہ تخت رہا۔ ہاں اسی شہر دہلی میں ایک غریب لڑکا رہتا تھا۔ اس کا نام حسن تھا۔ اس کی ایک چھوٹی بہن تھی۔ حسن کے ماں باپ اس دنیا سے چل بسے تھے۔ بیچارے حسن کو اپنی بہن کا بھی دھیان رکھنا پڑتا تھا۔

وہ کام کے لیے دہلی کی سڑکوں کی خاک چھانتا' کبھی کام ملتا کبھی کام نہیں ملتا۔ جس روز کام ملتا' اس روز گھر میں چولہا جلتا' جس دن کام نہیں ملتا' اس دن بھائی بہن بھوکے سو رہتے۔

اس دور میں دہلی میں ایک بزرگ رہتے تھے۔ ان کی خانقاہ شہر سے دور تھی۔ بچو' اللہ کے بزرگ بندے جس جگہ رہتے ہیں' اُسے خانقاہ کہتے ہیں۔ ان کے نام کا چرچا دور دور تک تھا۔ ان سے ملنے' ان سے دعائیں لینے' ان کی اچھی اچھی باتیں سننے کے لیے شاہ و گدا سب آتے' مگر وہ امیر غریب' چھوٹے بڑے میں کوئی فرق نہیں کرتے تھے۔ سب سے ایک جیسا سلوک کرتے' سب سے پیار و محبت کرتے' سب کی برابر برابر آؤ بھگت کرتے' مگر خود کسی سے ملنے نہیں جاتے تھے۔ جسے ملنا ہوتا' ان کے پاس آتا۔

حسن نے ان کا نام سن رکھا تھا۔ اس نے ایک دن سوچا: بزرگ سے ملنا چاہیے۔ ہو سکتا ہے ان کی دعا سے مجھے روز کام ملتا رہے اور میرا سویا ہوا نصیب جاگ اٹھے۔ یہ سوچ کر وہ ایک روز صبح سویرے گھر سے چل پڑا اور شام ہوتے ہوتے آپ کی خانقاہ تک پہنچا۔ وہاں دسترخوان بچھا ہوا تھا۔ لوگ آتے دسترخوان پر بیٹھتے' سیر ہو کر کھاتے اور ساتھ آپ کی دعائیں لے جاتے۔ اس وقت فقیر کے دسترخوان پر ہندوستان کے بادشاہ کا بیٹا محمد تغلق بیٹھا کھا رہا تھا۔ اس کے ساتھ اس کے نوکر چاکر اور دوست احباب بھی تھے۔ انہوں نے خوب سیر ہو کر کھایا اور بزرگ سے دعائیں لیں' اپنے اپنے گھوڑے پر سوار ہوئے اور یہ جا وہ جا۔

اس میں آپ کی محبت اور سفارش کا بھی ہاتھ ہے۔ آپ کا یہ احسان مرتے دم تک نہیں بھول سکتا"۔

گنگو برہمن نے موقع دیکھ کر کہا: "حسن تمہارے چہرے بشرے اور پیشانی کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ ایک روز تم ضرور بادشاہ بنو گے"۔

حسن بولا: "یہی بات خواجہ صاحب نے کہی تھی"۔ یہ کہہ کر اس نے خواجہ صاحب والا پورا واقعہ گنگو کو سنایا۔

گنگو برہمن نے کہا: "خواجہ صاحب نے تمہیں بڑی خوش خبری سنائی۔ آج مجھ سے وعدہ کرو کہ تم جب بھی بادشاہ بنو گے' مجھے اور میرے بال بچوں کو نہیں بھولو گے۔ تم اپنے نام کے ساتھ میرا نام جوڑو گے' تاکہ تاریخ میں تمہارے نام کے ساتھ ساتھ میں بھی زندہ رہ سکوں اور میرے بعد میرے بال بچوں کا ایسا ہی خیال رکھنا' جیسا کہ میں نے تمہارا رکھا"۔

حسن نے گنگو برہمن سے ہاتھ ملایا اور اس کی دونوں باتیں مان لیں۔

ہندی میں شمال کو "اتر" اور جنوب کو "دکھن" کہتے ہیں۔ دہلی کے بادشاہ فیروز تغلق نے اپنی حکومت اتر سے دکھن تک پھیلائی تھی۔ یہی دکھن بعد میں دکن کے نام سے مشہور ہوا۔

اتر میں رہ کر دکھن کا راج پاٹ سنبھالنا بہت مشکل کام تھا۔ بادشاہ نے بہت سوچ سمجھ کر حسن کو صوبے دار بنا کر دہلی سے دکن بھیجا۔ صوبے دار کسی حاکم سے کم نہیں ہوتا۔ آج کے دور میں صوبے دار ہی کو گورنر کہتے ہیں۔

حسن دکن پہنچا۔ اس نے بہت ہی ایمان داری' سچائی اور پوری لگن سے وہاں کا انتظام سنبھالا' رعایا کے دکھ درد کا خیال رکھا' غریبوں سے ہمدردی کی' کمزوروں کی مدد کی' ستائے ہوئے لوگوں کی فریادیں سنیں' انہیں انصاف دیا' اس طرح اس نے دکن کے لوگوں کے دل جیتے۔

پھر تاریخ میں ایک دن وہ بھی آیا کہ دکن کی بادشاہت حسن کے حصے میں آگئی۔ وہ علاؤ الدین حسن گنگو بہمنی کے نام سے دکن کا سلطان بنا۔ اس طرح خواجہ صاحب نے آنے والے وقت سے پہلے حسن کو جو خوش خبری سنائی تھی' وہ حرف بہ حرف سچ ثابت ہوئی۔

ریاض آفندی

ممتاز ادیب اور محقق ... ان کی تحریریں زبان و بیان کے اعتبار سے سادہ دلچسپ اور خیال انگیز ہوتی ہیں۔ ریاض آفندی اپنی تحریروں کے ذریعے بچوں کے ادب میں قابل قدر خدمات انجام دے رہے ہیں۔

پیارے بچو! ہم آپ کو خواجہ صاحب کا نام تو بتانا بھول ہی گئے۔ جانتے ہو اللہ کے وہ نیک بزرگ کون تھے؟ وہ بابا فریدؒ کے شاگرد خواجہ نظام الدینؒ تھے۔ آپؒ محبوب الٰہی کے نام سے بھی مشہور ہیں۔ آج بھی دہلی میں بستی نظام الدین بہت مشہور ہے۔ یہیں آپؒ کی خانقاہ تھی۔ آج آپؒ کی آخری آرام گاہ بھی یہیں پر ہے۔

حسن نے گنگو برہمن سے کیا ہوا وعدہ پورا کیا۔ دکن کا سلطان بننے کے بعد اس نے اپنے نام کے ساتھ گنگو بہمنی لگایا۔ آج تاریخ میں وہ علاؤ الدین حسن گنگو بہمنی کے نام جانا جاتا ہے۔ لفظ برہمن سے ہی بہمنی بنا۔

اس نے بہمنی خاندان کی بنیاد رکھی۔ سلطان کی حیثیت سے اس نے دکن پر گیارہ سال' دو ماہ' سات دن حکومت کی۔ اس کے بعد اس کے بیٹوں اور پوتوں نے حکومت کی۔ وہ سب بہمنی سلاطین کے نام سے مشہور ہوئے۔

دنیا میں جب تک مسلم حکمرانوں کی تاریخ پڑھی اور پڑھائی جاتی رہے گی' تب تک حسن کے ساتھ گنگو برہمن کا بھی ذکر ہوتا رہے گا اور تاریخ لکھنے والا بہمنی خاندان کی تاریخ لکھتے وقت اس واقعے کو لکھنا نہیں بھولے گا۔

☆☆☆

اگر تم اپنا راز اپنے دشمن سے چھپانا چاہتے ہو تو اس کو اپنے دوست سے بھی نہ کہو!

محبت

محبت جہاں میں ہے نعمت بڑی
محبت سے ہوتی ہے عزت بڑی
یہ دیکھا محبت سے انسان کو
بنا لیتا ہے اپنا مہماں کو
محبت میں چاہت کی تاثیر ہے
اسی سے ہر اک دل کی تعمیر ہے
جو دیکھو گے سب سے محبت یہاں
رہو گے جہاں میں عزیز جہاں
محبت کے باعث رہو گے بھلے
ملے گا تم کو [illegible] گلے
ہر اک غم پہ رکھے گا لطف و کرم
رہے گا تمہاری محبت کا دم
محبت ہی پیاری ہے ماں باپ کو
حق ان کا جو دیتے ہیں وہ خدا
نہ رکھو گے تم محبت اگر
نہ ہو گا تمہارا کسی دل میں گھر

بچو! آپ انڈوں کے متعلق کیا خیال رکھتے ہیں؟

"میں نے تو کتابوں میں پڑھا اور ڈاکٹروں سے سنا ہے کہ انڈے صحت کے لیے ضروری ہیں"۔

بہت پہلے کی بات ہے کہ میرے دل نے دھیرے سے ایک دن سرگوشی کی کہ انڈے کھاؤ' جان بناؤ۔ سالانہ امتحانات کے بعد میں گھر میں چھٹیاں منا رہا تھا کہ ایک دن دل نادان نے انڈوں کا تقاضا کر دیا۔ میں نے امی جان کے حضور ہنگامی نوعیت کی درخواست گزاری تو انہوں نے یہ کہتے ہوئے صاف انکار کر دیا کہ: "تم روزانہ ناشتے میں دو انڈے کھاتے ہو' ہر چیز میں اعتدال بہتر ہے۔ لہٰذا ایک ہی دن میں ڈھیر سارے انڈے کھانے کا جنون دل سے نکال دو۔ ویسے بھی انسانی جسم ضرورت سے زائد خوراک کو ضائع کر دیتا ہے۔ اس لیے یک لخت زیادہ غذا کھانا صحت کی دلیل نہیں بلکہ نظام انہضام پر بوجھ ہوتا ہے"۔

میں نے اپنے دل کو پرے لے جا کر کہا "میرے لاڈلے! سن لیا ہے ناخوراک کا فلسفہ!"۔

"ہاں' سن لیا ہے مگر میں نہیں مانتا" دل نادان بگڑ کر بولا۔

"تو پھر اب؟"

"انڈے کھاؤ' زبان کا چسکا لگاؤ" دل خواہ مخواہ مشورہ دینے پر تلا ہوا تھا اور..... وہ بھی مفت میں!

میرے لاڈلے دل کی بات دراصل میرے دل میں اتر گئی کہ انڈے کھاؤ' زبان کا چسکا لگاؤ' صحت چاہے بنے یا بگڑے' زبان کا لپکا تو پورا کرو۔ میری جیب کوئل کے گھونسلے کی طرح خالی تھی۔ میں گزشتہ روز جیب خرچ کا بے دریغ استعمال کر کے کچھ "فضولیات" خرید چکا تھا۔ جو لوگ کل کے لیے کچھ نہیں بچاتے وہ آڑے وقت میں بری طرح پچھتاتے ہیں۔ میں نے چپکے سے اپنے کمرے کا رخ کیا اور اپنے بستر میں گھس کر انڈوں کے حصول کے لیے سوچ بچار کرنے لگا۔

میں نے سوچا..... زیادہ سوچ بچار تو انسان کو نکما کر دیتی

ہے کہ اگر انسان سوچتا ہی رہے' منصوبے پہ منصوبہ بناتا چلا جائے اور اپنے ارادوں کو عملی جامہ نہ پہنائے تو اس کی زندگی عملی طور پر صفر پر جا پہنچتی ہے۔ اس خیال کا آنا تھا کہ میں پھدک کر بستر سے نکلا اور اپنی چھت پر جا پہنچا۔ میں نے اردگرد کا گہرا جائزہ لیا۔ پڑوسیوں کی چھت ہماری چھت کے ساتھ ہی ملی ہوئی تھی۔ میں ایک ہی قدم میں اسے عبور کر سکتا تھا۔ ان کے گھر میں مرغیاں بھی تھیں۔ اچانک ابا جان نے مجھے آواز دی۔ میں جلدی جلدی نیچے پہنچا تو ابا جان بولے "کیا بات ہے تم کیوں نچلے نہیں بیٹھتے؟' ڈھیر سارے انڈے کھاؤ گے تو اپنی صحت سے جاؤ گے"۔

میں نے امی جان کی طرف دیکھ کر کہا "سوال یہ ہے کہ میں طاقت ور بن گیا تو کیا ہو گا اور اگر کمزور پڑ گیا تو کیا ہو گا؟"

ابا جان نے میرے فلسفیانہ سوال پر شٹپٹا کر کہا "بات طاقت ور یا کمزور کی نہیں۔ میں خود بھی پہلوان نہیں۔ بات اصول کی ہے۔ تم روزانہ دو انڈے کھاتے ہو اور اب بھی دل میں انڈوں کی حسرت لیے پھرتے ہو۔ غذا کی غذائیت کو ماپنے کی اکائی "حرارہ" ہے جسے "کیلوری" بھی کہتے ہیں۔ جو لوگ مشقت کا کام کرتے ہیں' کھیل کود میں حصہ لیتے ہیں یا ورزش کرتے ہیں ان کے جسم میں موجود حرارے تو جزوِ بدن بن جاتے ہیں اور صَرف ہو جاتے ہیں مگر تم تو پیدل چلنے سے بھی کتراتے ہو۔ تم موٹاپے کا شکار ہونا چاہتے ہو تو سن لو کہ موٹاپا بیماری ہے' صحت کی علامت نہیں"۔

میں نے دلِ نادان سے پوچھا "کوئی فرق پڑا ہے کہ نہیں"۔

دل نے وہی رٹ لگائے رکھی۔ میں نے دل کی بات پر دھیان دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ ابو' امی میرے چھوٹے بھائی بہن کو ساتھ لے کر اتوار بازار چلے گئے اور میں ایک ہی قدم میں تین فٹ کا خلا عبور کر کے پڑوس کی چھت پر جا پہنچا۔ میں نے چھت پر بلی کی طرح نرم نرم قدم رکھے تاکہ کوئی کھٹکا نہ ہو۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ مجھے لالچ خود ہی چوری کا گُر سکھا رہا تھا۔ میں نے نیچے جھانک کر دیکھا' پڑوسی نہ جانے کہاں گئے ہوئے تھے۔۔۔ میدان صاف تھا' کمرے بند نظر آ رہے تھے۔ پڑوسی بھی یقینی طور پر اتوار بازار میں ہی ہوں گے' میں نے سیڑھیوں سے نیچے اترتے ہوئے دل میں سوچا۔

پڑوسیوں کے گھر میں ایک کھلا اور ہوادار دڑبا پڑا تھا۔ میں نے دیکھا اس میں دو موٹی مرغیاں تشریف فرما تھیں اور درجن بھر رنگ برنگ مرغیاں ادھر ادھر ٹہل رہی تھیں۔ دڑبے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اچانک میری نظر ساتھ بنے ہوئے ایک چھوٹے سے دڑبے پر پڑی جس کے باہر کوئی جالی وغیرہ نہیں تھی بلکہ لکڑی کے تختے جڑے ہوئے تھے۔ میں نے سوچا اس میں انڈے ہوں گے۔ چنانچہ آگے بڑھ کر اسے جونہی کھولا اس میں سے ایک موٹی سرخ مرغی پھدک کر باہر نکل آئی اور میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔۔۔ اس چھوٹے سے دڑبے میں روئی کے گالوں پر موٹے موٹے انڈے بڑے سلیقے سے پڑے تھے۔

ایک موٹا تازہ مرغا بار بار آواز نکال کر سب مرغیوں کو میری آمد سے خبردار کر رہا تھا لیکن مجھے اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔ چھوٹے دڑبے میں سے نکلنے والی سرخ مرغی غیر معمولی طور پر بڑی تھی۔ وہ صحن میں ٹہل رہی تھی۔ اس نے اس وقت غراہٹ بھری آوازیں نکالیں جب میں نے موٹے انڈوں کو اپنے کرتے کی جھولی میں منتقل کرنا شروع کر دیا۔ میں نے اسے پچکارا "اچھی مرغی! پیاری مرغی! دل چھوٹا نہ کرو تم تو مرغی ہے تجھے اللہ اور انڈے دے گا۔۔۔ پھر اور۔۔۔ پھر اور" مرغی نے باقاعدہ غصیلی آواز میں کٹ کٹاک شروع کر دیا۔ مرغا بھی مجھ پر حملہ آور ہونے کے لیے پر تولنے لگا۔ اس وقت تک میرا "اسپیشل مشن" مکمل ہو چکا تھا۔ میں نے اداس مرغی کو سلام کیا اور اس گھر پر الوداعی نظر ڈال کر چل دیا۔

زینوں پر چڑھتے ہوئے میں نے شہر کی انتظامیہ کو سراہا جس نے "اتوار بازاروں" کا باقاعدہ انعقاد کر کے مجھ جیسے نہ جانے کتنے حاجت مندوں کے لیے میدان صاف کیے تھے۔ میں نے سوچا کہ شہر میں جمعہ بازار' اتوار بازار اور پھر منگل اور بدھ بازاروں کا میلا لگا رہنا چاہیے تاکہ حاجت مند اپنی اپنی حاجت پوری کرتے رہیں۔۔۔ میرا بھی یہ سلسلہ جاری و ساری رہے۔ چھت پر جا کر مجھے ذرا محسوس ہوا کہ میں نے غلط کام کیا تھا۔ میں نے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا اور اپنی چھت پر آ گیا۔ غلط کاری کا احساس ہو رہا تھا اور دل قدرے تیز دھڑک رہا تھا۔ میں نے دل کی رفتار پر کوئی توجہ نہ دی۔ اس کا تو کام ہی دھڑکنا ہے' آہستہ نہ سہی ذرا تیز سہی۔

میں نے انڈے اپنے کمرے میں چارپائی کے نیچے چھپا دیئے' پورے اٹھارہ انڈے تھے اور رال تھی کہ میرے منہ سے زبردستی ٹپکے جارہی تھی۔ گھر میں اس وقت میرے سوا اور کوئی نہیں تھا' لیکن میں پھر بھی انڈے چھپاتا پھر رہا تھا کیوں کہ میرے دل میں چور گھس آیا تھا۔ میں نے گھر کا بیرونی دروازہ اچھی طرح بند کر کے' انڈے ابالنے کے لیے ایک ہنڈیا میں پانی ڈالا اور اسے تیل کے چولہے پر رکھ دیا۔ پھر میں نے چولہے کو آگ دکھائی اور باورچی خانے میں ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد پانی گرم ہو کر ابلنے لگا تو میں نے انڈے پانی میں ڈال دیئے اور انہیں خوب جوش دیا۔ آخرکار وہ وقت آگیا کہ میں اپنے کمرے میں لکھنے پڑھنے والی میز پر "شاد اور آباد" بیٹھا فاتحانہ انداز میں مسکرا رہا تھا۔ میرے سامنے میز پر تین چیزیں پڑی تھیں' اٹھارہ انڈوں سے بھرا ہوا تھال' نمک دان اور انڈوں کے چھلکے پھینکنے کے لیے ایک عدد ٹوکری۔

لیکن میرا یہ اہتمام دھرے کا دھرا رہ گیا اس لیے کہ باہر دروازے پر کوئی دستک دینے لگا تھا۔ میری تو روح فنا ہو گئی۔ میری عقل پکار اٹھی..... قریشی صاحب آئے ہوں گے۔ قریشی صاحب ہمارے عزیز پڑوسی ہیں جن کے گھر سے میں اٹھارہ انڈے اٹھا لایا تھا۔ میں نے انڈے چھپائے اور دھڑکتے دل کے ساتھ دروازہ کھولا..... سامنے بیگم قریشی کھڑی تھیں۔ میں نے خود پر قابو پایا اور پرتپاک علیک سلیک کے بعد انہیں اپنے گھر میں تشریف لانے کی دعوت دی مگر انہوں نے مجھ سے اہل خانہ کا پوچھا اور جب انہیں یہ پتا چلا کہ میں اس وقت گھر پر اکیلا ہوں تو انہوں نے مجھے شک کی نظروں سے دیکھتے ہوئے بتایا کہ ان کے گھر سے انڈے چوری ہو گئے ہیں۔

میں نے نامعلوم چور کے بارے میں الٹ پلٹ برے الفاظ استعمال کیے اور انہیں دلاسا دیا کہ جب ہمارے گاؤں سے اصل مرغیوں کے انڈے آئیں گے تو میں انہیں وہ نایاب انڈے دے کر ان کے نقصان کا ازالہ کرنے کی کوشش کروں گا کیوں کہ ہمسایہ عزیز سے بڑھ کر ہوتا ہے۔

مگر افسوس' وہ مجھے زہر بھری نظروں سے دیکھتی رہیں۔ میں اس وقت بالکل نڈر تھا کیوں کہ میں مسروقہ انڈے اپنی امی کی خاص پیٹی میں چھپا کر تالا لگا چکا تھا۔ لہٰذا میں نے گھر کا دروازہ چوپٹ کھول کر انہیں دعوت دی کہ وہ گھر کی تلاشی لے کر اپنا شک رفع کر لیں..... میری ترکیب کامیاب رہی اور وہ واپس چلی گئیں۔

ادھر میں نے پھر اپنا ضروری سامان میز پر سجا کر انڈے اڑانے کے لیے کمر کس لی۔ میں نے اپنی آستینیں چڑھا کر ایک انڈا پکڑا ہی تھا کہ ٹیلی فون سیٹ کی گھنٹی بج اٹھی..... سارا مزہ کرکرا ہو گیا۔ یہ لوگ کسی کو اس کی محنت کا پھل بھی مزے سے کھانے نہیں دیتے۔ میں نے ٹیلی فون کی آہ و بکا سے بچنے کے لیے فون کال سننے کا ارادہ کیا اور جب ریسیور اٹھایا تو آٹھ گھنٹیاں بج چکی تھیں۔

دوسری طرف کوئی صاحب تھے جو بہت بڑا کیک تیار کرانا چاہتے تھے۔ لوگ نمبر دیکھے بغیر فون کال ملاتے رہتے ہیں۔

"کس مقصد کے لیے؟" میں نے تفتیش شروع کر دی۔

"اپنی بیٹی کی سالگرہ منانے کے لیے" جواب ملا۔

"شرم آنی چاہیے آپ کو" میں نے انہیں ڈانٹا "حکومت تو شادی پر بھی عوام کی بچت کی خاطر انہیں ون ڈش پر مجبور کرتی ہے اور آپ ہیں کہ سالگرہ پر دس ٹن کے کیک سے گل چھرے اڑانے کا پروگرام بنا رہے ہیں"۔

"جی" وہ ہکا بکا رہ گئے۔

"ہاں جی..... میں خود کئی صدیوں سے انڈوں کا بھوکا ہوں' مجھے انڈے کھانے دیں' میں باقی ماندہ انڈے آپ کو ایک چھوٹا کیک بنانے کے لیے عطیہ کر دوں گا..... خدا حافظ!"

میں نے ٹیلی فون رسیور کریڈل پر جمایا اور خود میز کے سامنے دوبارہ جم گیا۔ میں نے ایک پہلوان قسم کا انڈا اٹھایا ہی تھا کہ دروازے پر پھر دستک ہوئی۔ میں بہت بے زار ہو چکا تھا۔ میں نے کمرے کی کھڑکی کھول کر باہر گلی میں جھانکا تو ایک ہٹی کٹی بھکارن کھڑی تھی۔

"یس میڈم!" میں نے اسے مخاطب کیا۔

جواب میں اس نے اپنی زور دار آواز میں گرج برس کر مجھے جنت کا مژدہ سنایا۔

ویری سوری میڈم! آپ نے بہت دیر کر دی..... میں جنت میں ایک محل اپنے لیے مخصوص کرا چکا ہوں۔

پھر میں نے کھٹ سے کھڑکی بند کر دی اور انڈوں پر ٹوٹ پڑا۔ باہر سے اس بھکارن کی آواز سنائی دے رہی تھی جو جاتے جاتے مجھ ناچیز پر غصہ جھاڑ رہی تھی۔ میں نے اپنے کان بند کر کے ایک انڈا چھیلا تو اندر سے ایک لوھورا چوزہ برآمد ہوا۔ میرا دل بہت خراب ہوا۔ میں سمجھ گیا کہ میں اپنی ناجائز خواہش کے جنون میں کڑک مرغی کے نیچے سینے کے لیے رکھے گئے انڈے اٹھا لایا ہوں۔

میں نے باقی ماندہ انڈوں کو گھی کے خالی ڈبے میں بند کیا تاکہ ان پر گلی کے کسی مخبر کی نگاہ غلط انداز نہ پڑے اور پھر گھر سے نکل پڑا۔ ہمارے علاقے میں ایک دکان دار بالکل نیا آیا تھا اور وہ تھا

حامد مشہود

معروف ادیب اور کامیاب کہانی کار۔ ان کی کہانیاں' موضوع اور نفس مضمون کے حوالے سے نہایت کامیاب قرار دی جا سکتی ہیں۔ خالصتاً بچوں کی تربیت اور تعمیر کردار کے لیے لکھتے ہیں۔ ان کا یہ جذبہ بلاشبہ قابل ستائش ہے۔

بھی ایک سادہ لوح انسان' بالکل سیدھا سادا سا۔ میں نے مشق ستم کے لیے اس کا انتخاب کیا اور اسے یہ کہہ کر انڈے فروخت کر دیئے کہ ہم دس بارہ دنوں کے لیے کہیں جا رہے ہیں۔ بابا جی نے سستے بھاؤ مجھ سے انڈے خرید لیے۔ میں نے حاصل کردہ رقم لے کر ایک اور دکان کا رخ کیا اور دس انڈے خرید کر اپنے گھر پہنچا۔ واپسی پر میں نے تیز آنچ پر انڈے ابالے نمک لگا لگا کر ابلے ہوئے انڈے کھائے اور پیٹ کا دوزخ بھرا۔ ایک وقت میں' میں نے دس انڈے کھا تو لیے مگر اب انہیں ہضم کرنے کے لیے کھیل کود بھی ضروری تھا۔

میں نے اپنی واردات کے تمام شواہد مٹا ڈالے اور اہل خانہ کے گھر واپس آتے ہی کھیلنے چلا گیا۔ شام کے وقت میں تھک ہار کر واپس آیا' تھوڑا بہت کھانا کھایا اور بستر میں گھس کر سو گیا۔ چھٹیوں کی فراغت' کھیل کود کی تھکن اور پھر اوپر سے "گڑ بڑ" انڈوں کا البیلا سا نشہ۔ میں پوری طرح خواب خرگوش میں بے ہوش نیند کے مزے لینے لگا۔ لیکن خواب خرگوش کا وقفہ ہمیشہ بہت کم اور اس کا نتیجہ خوف ناک ہوتا ہے۔ میری ساری نیند کا نشہ اس وقت ہرن ہو گیا' جب ابا جان مجھے بستر سے نکال کر گھر کے دروازے پر لے گئے۔ باہر قریشی صاحب کھڑے تھے۔ میں نے انہیں ادب و احترام سے سلام کیا جس کا انہوں نے نہ صرف جواب دیا بلکہ گرم جوشی سے میرے ساتھ مصافحہ بھی کیا۔

عین اس وقت بوڑھا دکان دار گھر کے دروازے کے ایک طرف سے نکلا اور اس نے مجھے پہچان لیا کہ: اسی لڑکے نے مجھے

آج دوپہر ستائیس انڈے فروخت کیے ہیں۔ میرے پیروں تلے زمین نکل گئی۔ بابا جی مجھے کیسے جانتے تھے۔ تھی نا حیرت کی بات؟

ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلا اور ابا جان کے چند دوست بھی وہاں آگئے۔ ان سب لوگوں کی باتوں سے مجھے حقیقت کا اندازہ ہوا۔ ہوا یوں کہ رات ابا جان کے چند دوست ان سے ملنے آگئے اور اسی وقت قریشی صاحب بھی اپنے بھائی کی شادی کی مٹھائی لے کر آگئے۔ جب میں نے ان کے گھر جا کر انڈوں پر ہاتھ صاف کیے تھے تو وہ اس وقت سب کے سب دعوت پر ہی گئے ہوئے تھے۔ ابا جی نے انہیں بھی اپنے دوستوں کے ساتھ بٹھایا اور دکان سے انڈے بسکٹ لے آئے تاکہ چائے کا دور چل سکے۔ پھر چائے کا دور چلا' بسکٹ بھی ٹھیک چلے لیکن انڈے نہ چل سکے کیوں کہ ان

کے اندر موجود ادھورے چوزے ابھی چلنے کے قابل نہیں تھے۔

ابا جان آگ بگولا ہو کر دکان دار کے پاس اور دکان دار میرے پاس..... ابا جان کا پارا ہزاروں سینٹی گریڈ تک پہنچ گیا اور ان کی سرخ آنکھوں سے شعلے برسنے لگے۔ انہوں نے مجھے "سمجھانے بجھانے" کے لیے ایک عدد بانس کا ڈنڈا کہیں سے حاصل کیا۔ حالات و واقعات بھانپ کر میں نے صورت حال کا بغور جائزہ لیا اور..... سرپٹ بھاگ کھڑا ہوا۔ پھر کیا تھا' ابا جان بھی شالیمار ایکسپریس کی طرح گرجتے برستے میرے تعاقب میں لپکے چلے آرہے تھے۔ میرا خیال تھا کہ وہ تھک کر پیچھے رہ جائیں گے مگر مناسب متوازن غذا اور ورزش کا برا ہو کہ وہ مجھ سے بھی آگے نکلے جارہے تھے۔

گو کہ رات کے اندھیرے میں بھی شہر کی گلیاں یوں روشن تھیں کہ فرش پر پڑی سوئی بھی نظر آتی تھی مگر مجھے اس وقت کوئی بھی راستہ نظر نہیں آرہا تھا۔ میں یوں اندھا دھند بھاگتا چلا جارہا تھا کہ جہاں سینگ سماتا وہیں گھس جاتا۔ اپنی ناجائز خواہشات کا اندھا دھند تعاقب کرنے والے انسان کے ساتھ یوں ہی ہوتا ہے کہ اسے روشنی میں بھی راستہ نظر نہیں آتا اور وہ زندگی میں ٹھوکریں کھاتا پھرتا ہے اور بالآخر منہ کے بل گرتا پڑتا ہے۔

اندھا دھند بھاگتے بھاگتے مجھے بھی ایک "اعلیٰ قسم" کی ٹھوکر لگی اور میں منہ کے بل دھڑام سے نیچے گرا۔ ابا جان مجھ پر شاہین کی طرح جھپٹے تو میں نے آخری اور حتمی فیصلہ یہ کیا کہ میں آئندہ کسی ناجائز خواہش کا اندھا دھند تعاقب نہیں کروں گا۔ اور پھر..... اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی۔ ☆☆☆

یہ دنیا مقابلے کی دنیا ہے۔ اگر آپ
دوسروں سے آگے نہیں بڑھتے تو دوسرے
آپ سے آگے بڑھ جائیں گے!

☆☆☆

کرنے والے ہمیشہ اپنا کام آج کے دن کرتے ہیں
اور نہ کرنے والے ہمیشہ اپنا کام کل کے دن!

ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

علم و ادب کا ہمالہ

ڈاکٹر وزیر آغا

کہتے ہیں کسی ٹہنی پر جس قدر پھل لگا ہوا ہو وہ اتنی ہی زیادہ جھکی ہوتی ہے۔ بالکل اسی طرح جتنا کسی کے پاس علم و ادب کا خزینہ ہوتا ہے اسی قدر اس کی شخصیت سادگی اور مروت و انکساری سے بہرور ہوتی ہے۔ علم و حکمت کی دولت بلاشبہ انسان کو تمام آلائشوں' بناوٹوں اور خود نمائی و خود ستائی سے بے نیاز کر دیتی ہے اور دل و دماغ میں ایسے چراغ روشن کرتی ہے کہ جن کی روشنی میں نہ صرف خود فریبی کے اندھیرے مٹ جاتے ہیں بلکہ زندگی کی تمام تر حقیقتیں روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہیں۔ پھر جن اہل علم کی نظریں حقیقت آشناہوں ان کی محفلیں اور صحبتیں بھی علم و آگہی کے حصول کا یقینی ذریعہ ثابت ہوتی ہیں۔

گزشتہ دنوں ہمیں ایک ایسی ہی شخصیت سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ پھلدار درخت کی طرح متواضع' علم و ادب کی بے پایاں دولت سے مالا مال' نہایت شفیق' ہنس مکھ اور شیریں لہجے کی مالک اس عظیم شخصیت سے مل کر ہمیں اندازہ ہوا کہ واقعی "جیسا سنا تھا اس سے بڑھ کر پایا"۔

لیجئے! یہ ہے لاہور کینٹ کی مشہور سرور شہید روڈ جس پر واقع ایک خوبصورت بنگلے میں شہر کی ہاؤ ہو سے بے نیاز اور بے ہنگم شور شرابے سے دور' خاموش اور پر فضا ماحول میں ایک ایسی شخصیت نے من کی دنیا آباد کر رکھی ہے جس کا اوڑھنا بچھونا صرف اور صرف لکھنا اور پڑھنا ہے۔

ننھے ساتھیو! آپ تو جانتے ہی ہوں گے کہ لکھنا پڑھنا کسی عبادت سے کم نہیں۔ لہٰذا ہماری یہ محترم شخصیت "لکھنے پڑھنے" کی عبادت میں کچھ ایسی محو ہے کہ شعر و ادب کی آبیاری کرتے ہوئے روز و شب تخلیقی سرگرمیوں میں مصروف کار نظر آتی ہے۔

انسان کے اندر محنت' لگن اور جذبے کی سچائیاں موجود ہوں تو مصروفیت اور کام کے تسلسل ہی سے اسے جولانی طبع' جواں ہمتی اور سرشاری کا رزق ملتا رہتا ہے۔ کام کی اسی لگن' جذبے کی اسی سچائی اور شاید قلب و نظر کی اسی بے پایاں یکسوئی نے زندگی کے ماہ و سال کے ہاتھوں چہرے کی شگفتگی اور شادابی کو ماند نہیں پڑنے دیا۔ کشیدہ قامت' اکہرا بدن' چشمے کے پیچھے ذہین چمکتی ہوئی آنکھیں' ہونٹوں پر کھیلتی مسکراہٹ' کتابی چہرہ' پر سکون' دھیما اور میٹھا لہجہ' کھلتا ہوا رنگ' کشادہ دلی' مروت اور داخلی نظم و تہذیب کی چغلی کھاتی ہوئی روشن پیشانی ..... یہ ہیں ہمارے اور سب کے ڈاکٹر وزیر آغا! اب تو آپ جان گئے ہوں گے کہ ہم کس علم دوست اور ادب نواز شخصیت کا ذکر رہے ہیں۔

ڈاکٹر وزیر آغا کا نام اردو زبان و ادب میں تحقیق' نقد و نظر' شاعری اور تصنیف و تالیف کے حوالے سے ملکی اور غیر ملکی سطح پر مقبول و معروف ہے۔ آپ 18 مئی 1922ء کو وزیر کوٹ ضلع سرگودھا میں پیدا ہوئے۔ والد صاحب اگرچہ زراعت پیشہ تھے تاہم صاحبِ مطالعہ اور علم و ادب کا اعلیٰ ذوق رکھنے والے تھے۔ لہٰذا کتاب کے ساتھ وزیر آغا کا ذہنی و قلبی تعلق بچپن ہی سے کچھ ایسا استوار ہوا کہ پھر کبھی منقطع نہ ہو سکا۔ آپ نے میٹرک کا امتحان لالیاں سے پاس کیا۔ انٹرمیڈیٹ گورنمنٹ کالج جھنگ سے کیا۔ اس کے بعد آپ نے گورنمنٹ کالج لاہور سے معاشیات میں ایم اے کی ڈگری اعزاز کے ساتھ حاصل کی۔ ایم اے کرنے کے بعد آپ سرگودھا میں اپنی خاندانی زمینوں کی دیکھ بھال میں مصروف ہو گئے۔ زمینداری کی کچھ اپنی ہمہ وقتی مصروفیات اور ذمہ داریاں ہوتی ہیں مگر وزیر آغا ان مصروفیات میں سے مطالعہ و تحقیق کے لیے ضرور وقت نکال لیا کرتے تھے۔ وزیر کوٹ (سرگودھا) میں ان کی حویلی ان کے لیے کچھ یوں گوشۂ عافیت ثابت ہوئی کہ آپ اپنی ذاتی لائبریری میں قدرتی سرسبز و شاداب ماحول میں پوری یکسوئی کے ساتھ لکھنے پڑھنے میں مصروف رہ کر علم کی پیاس بجھاتے رہتے۔ علم و ہنر کی طلب اگر انسان کے دل و دماغ میں موجود ہو تو ہزار رکاوٹوں کے

باوجود وقت کے ساتھ ساتھ حصول علم کے راستے مزید کھلتے چلے جاتے ہیں۔ تاریخ انسانی بہت سی ایسی عظیم شخصیات کے تذکروں سے بھری پڑی ہے جنہوں نے آبائی پیشوں اور طبیعتاً مختلف مشاغل اپنانے کے باوجود شوق، لگن اور غیر متزلزل ارادوں کے بل بوتے پر سنگلاخ رکاوٹوں پر قابو پا کر اپنے لیے نئی اور منفرد راہیں تلاش کیں۔ بلاشبہ وزیر آغا بھی انہی اولوالعزم شخصیات میں شمار کیے جا سکتے ہیں۔

وزیر کوٹ کی شاداب لہلہاتی فصلیں، سرسبز پھلدار اور چھتنار درختوں کی ٹھنڈی میٹھی چھاؤں اور صحت بخش صاف و شفاف ماحول بھی تادیر وزیر آغا کو لاہور کی ادبی فضاؤں سے دور نہ رکھ سکا اور علم و حکمت کا یہ متلاشی انسان آخر چپ چاپ لاہور چلا آیا۔ لاہور کی ادبی چوپالیں وزیر آغا کی منتظر تھیں۔ یہاں کے ادبی حلقوں نے انہیں خوش آمدید کہا اور یہ بھی اپنی خداداد تخلیقی صلاحیتوں کے بل بوتے پر شعر و ادب کے آسمانوں پر خورشید جہاں تاب بن کر چمکے۔

وزیر آغا اردو ادب میں ہمیشہ نئے افق تلاش کرتے رہے۔ آپ نے "اردو ادب میں طنز و مزاح" کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھا جس پر 1956ء میں پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے آپ کو پی ایچ ڈی کی ڈگری عطا کی گئی۔

ڈاکٹر وزیر آغا نے 1960ء میں مولانا صلاح الدین کے ساتھ معروف ماہنامہ "ادبی دنیا" کے شریک مدیر کی حیثیت سے اپنی ادبی و فنی سرگرمیوں کا باقاعدہ آغاز کیا۔ 1966ء میں آپ نے سہ ماہی "اوراق" کا اجرا کیا۔ "اوراق" دنیا کے ہر حصے میں جہاں اردو زبان بولی پڑھی اور سمجھی جاتی ہے نہایت مقبول، معتبر اور تخلیقی و تحقیقی میگزین شمار کیا جاتا ہے۔ اس دوران ڈاکٹر وزیر آغا نے تصنیف و تالیف اور تحقیق کا کام بھی برابر جاری رکھا۔ اردو جامع انسائیکلو پیڈیا "اردو دائرہ معارف اسلامیہ" کے لیے آپ نے کئی معرکہ آرا تحقیقی مقالے لکھے اور ادبی دنیا سے داد وصول کی۔ آپ کی شاعری علمی وسعت، جذبے کی گہرائی اور احساسات کے تنوع سے مالا مال نظر آتی ہے۔ شاعری کے کئی مجموعے مثلاً شام اور سائے، دن کا زرد پہاڑ، نردبان اور آدھی صدی کے بعد آپ کے شاعرانہ محاسن کی قابل قدر مثالیں ہیں۔ اردو ادب میں تنقید اور تحقیق آپ کا خاص میدان ہے۔ اس لحاظ سے آپ کی تصانیف اردو شاعری کا مزاج، نظم جدید کی کروٹیں، تخلیقی عمل، نئے مقالات، نئے تناظر وغیرہ انقلاب آفرین کتابیں ہیں۔ آپ کے انشائیوں کے بھی متعدد مجموعے داد و تحسین وصول کر چکے ہیں۔ آپ کی نظموں کے متعدد عالمی زبانوں میں ترجمے ہو چکے ہیں۔ اردو زبان و ادب کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جسے آپ نے اپنی تحقیق، تنقید اور تخلیقی حسن کاری سے زندہ و تابندہ نہ بنا دیا ہو۔

ڈاکٹر وزیر آغا کے تخلیقی کام کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہو گا کہ پورے برصغیر میں اردو ادب کی آبیاری اور نقد و تحقیق کا جو بیڑہ موصوف نے اٹھایا تھا اس میں وہ کما حقہ، کامیاب و سرخرو ہوئے ہیں بلکہ ان کی عملی و ادبی خدمات کے تناظر میں ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ نقد و نظر کے معیار کو آپ نے جو سربلندی اور اعتبار بخشا ہے اس کی مثال ملنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ جس تندہی، لگن اور وسیع مطالعے کی ضرورت ایک تنقید نگار کو ہوتی ہے، ڈاکٹر وزیر آغا بلاشبہ ان لوازمات سے بخوبی بہرہ ور ہیں بلکہ اس عمر میں بھی ان کی جانفشانی، ہمت لگن اور ذوق و شوق کو دیکھتے ہوئے انسان ورطۂ حیرت میں ڈوب جاتا ہے۔

وہ کہتے ہیں نا کہ انسان کا انداز فکر مثبت اور تعمیری ہو تو ہمت، تنومندی اور ذوق و توفیق کی تمام تر توانائیاں وہ اپنی مسلسل جدوجہد اور اعصاب شکن محنت ہی سے کشید کرتا ہے۔ شاید کچھ ایسا ہی آپ بقا قدرت نے وزیر آغا جیسی جواں ہمت شخصیت کے لیے ہمہ دم ارزانی فرما رکھا ہے۔ ایسے باہمت لوگ بلاشبہ صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں جن کے نقوش قدم بعد میں آنے والوں کے لیے مشعل راہ ثابت ہوتے ہیں۔

ننھے ساتھیو! جس قوم میں "بڑے لوگ" موجود ہوں اس کا مستقبل روشن اور تابناک ہوتا ہے اس لیے کہ ان کا کام ماضی کے تناظر میں زمانہ حال کی آئینہ بندی کے ساتھ ساتھ آنے والے زمانوں پر بھی حاوی ہوتا ہے۔ ایسے عظیم لوگ بلاشبہ صاحب توقیر اور ہم سب کے لیے قابل تقلید ہوتے ہیں۔ (جاوید امتیازی)

☆☆☆☆☆☆

ہونہار مصور

گرمی آئی

ایمن شکیل' کراچی (پہلا انعام: 100 روپے کی کتابیں)

فرحین مصطفیٰ' دندی اٹک (دوسرا انعام: 75 روپے کی کتابیں)

فریحہ نصیر' لاہور (تیسرا انعام: 50 روپے کی کتابیں)

نویرہ گل' ڈیرہ اسماعیل خان (چوتھا انعام: 45 روپے کی کتابیں)

سیدہ رابعہ بصری' کراچی (پانچواں انعام: 40 روپے کی کتابیں)

وریشا احمد' راولپنڈی (چھٹا انعام: 35 روپے کی کتابیں)

ان ہونہار مصوروں کی تصویریں بھی اچھی ہیں: عدنان احمد فیصل آباد۔ جنت ندیم ڈیرہ غازی خان۔ عدنان منیب قصور۔ وردہ تبسم قصور۔ عائشہ پروین کراچی۔ محمد نوریز اقبال فیصل آباد۔ ارسلان اسلم سانگلہ ہل۔ آمنہ شہزادی راولپنڈی۔ قیصر فاروق پشاور۔ سلیم احمد حیدر آباد۔ عسال طاہر لاہور۔ اقصیٰ طاہر لاہور۔ شہیر ثاقب راولپنڈی۔ جمشید تنویر کوئٹہ۔ احمد علی کراچی۔ ایمن سہیل اسلام آباد۔ مہرین ندیم ڈی جی خان۔ احمد عارف فیصل آباد۔ گلنار خاکوانی ملتان۔ عدنان نعیم واہ کینٹ۔ ثاقب قیوم سیالکوٹ۔ علی حسن لاہور۔ کاشان گوہر سکھر۔ سلیمہ نورین مظفر آباد۔ شاہین صدیقی کراچی۔ شبنم یزدانی اسلام آباد۔ فریدہ حسن قصور۔

آخری تاریخ 10 جون

ہدایات: تصویر 6 انچ چوڑی، 9 انچ لمبی اور رنگین ہو۔ تصویر کی پشت پر مصور اپنا نام، عمر، کلاس اور پورا پتا لکھے اور اسکول کے پرنسپل یا ہیڈ مسٹریس سے تصدیق کروائے کہ تصویر اسی نے بنائی ہے۔

آئیے دوست بنائیں

سندیل بن حلیم 10 سال
کرکٹ اور کمپیوٹر گیم کھیلنا
A-24 آفیسر کالونی
ملتان

حافظ محسن اشرف 13 سال
تعلیم و تربیت پڑھنا
آرائیں کالونی گلی نمبر 8 مکان نمبر
3 صادق آباد ضلع رحیم یار خان

محمد حارث کمیٹران 16 سال
کمپیوٹر چلانا' قلمی دوستی
معرفت عبدالحمید سائنس ٹیچر
گورنمنٹ سنڈیمن سکول کوئٹہ

شہروز شہزاد 12 سال
بیڈ منٹن کھیلنا' کتابیں پڑھنا
586 فیز II اینکس سوسائٹی
گوجرانوالہ کینٹ

شاہ رخ فرخ 9 سال
کرکٹ کھیلنا' ڈرائنگ بنانا
شادمان ٹاؤن سیکٹر 14/8
مکان نمبر R.397 کراچی

محمد علیم مقصود 14 سال
کمپیوٹر چلانا
مکان نمبر 17/C سیٹلائٹ
ٹاؤن بہاولپور

محمد داؤد 15 سال
کہانیاں پڑھنا
احتشام میڈیکل سٹور
جام پور

فہد منظور 15 سال
کرکٹ کھیلنا' اسکیٹ
135 امیر کالونی گلی نمبر 3
اوکاڑہ

ارسلان انور 14 سال
انٹرنیٹ
کشمیر ہاؤس مندرہ' تحصیل گوجر
خان' ضلع راولپنڈی

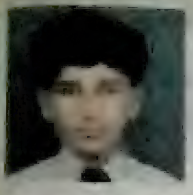

محمد اویس شہزاد 7 سال
تعلیم و تربیت پڑھنا' کرکٹ
کھیلنا' سائیکلنگ
اے۔ایم 5/8 کارف کالونی کامرہ کینٹ

حافظ ناصر خان 18 سال
قلمی دوستی
فیروز والا روڈ چاندنی چوک
نیازی ڈیزل اسٹور گوجرانوالہ

عبداللہ ابوبکر 9 سال
اسلامی کتب کا مطالعہ' کرکٹ
مکان نمبر 629' گلی نمبر 21'
شہزاد ٹاؤن اسلام آباد

راحیل خان 14 سال
قرآن پاک کی تلاوت کرنا
میرپور کلاں
ایبٹ آباد

معظم جاوید چیمہ 15 سال
قلمی دوستی' مطالعہ کرنا
مکان نمبر C-2 گرڈ اسٹیشن
کالونی واپڈا گکھڑ منڈی

عزیز احمد 11 سال
تعلیم و تربیت پڑھنا' کمپیوٹر'
دستگیر کراچی مکان 1451/15
الاخوان مسجد کراچی

علی حسن عارف 13 سال
کرکٹ کھیلنا
نیو سیٹلائٹ ٹاؤن
سرگودھا

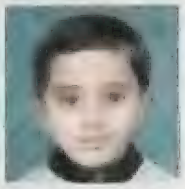

محمد راشد اکرم 9 سال
کرکٹ کھیلنا' مطالعہ کرنا
دھوپ سڑی' تحصیل چونیاں
ضلع قصور

عشار اسعد 17 سال
کرکٹ' ٹیبل ٹینس کھیلنا
6/6 ایم بلاک گلبرگ-3' لاہور

اسعد رحمان 5 سال
کرکٹ
189/5 گلی نمبر 13
MRF کالونی کامرہ

ذکی الرحمان 12 سال
کرکٹ کھیلنا' تعلیم و تربیت پڑھنا
مکان نمبر 71-70 ٹانگی
میرپور (آزاد کشمیر)

ظہور الحق قریشی 15 سال
کمپیوٹر چلانا
مکان نمبر B1316 گلی ریاض خان
محلہ رحیم پورہ ہزارہ روڈ حسن ابدال

حافظ ضیاءاللہ ضیائی 14 سال
کہانیاں پڑھنا' شعر و شاعری
بستی محمد پور مدرسہ ضیاء القرآن
نزد ریلوے پھاٹک شجاع آباد

آئیے دوست بنائیں کے لیے یہ کوپن پر کر کے اور پاسپورٹ سائز رنگین تصویر بھیجنا ضروری ہے۔
(لڑکیاں اس میں حصہ نہیں لے سکتیں)

نام: 60. بلال. عمر. بسال. usmania dawakhana
مشاغل: Dance کرنا
پتا: نمبر 920 بدمعاش محلہ

سیلاب

قسط 4

وہ مارا!

اعتبار ساجد

دوسرے دن کی شام تک راجہ کو ان کے نام بھی معلوم ہو گئے اور یہ بھی پتا چل گیا کہ سب کے پاس بندوقیں اور نیزہ نما لاٹھیاں ہیں۔ وہ لوگ آدم پور میں کئی دن سے ٹھہرے ہوئے تھے۔ یہ مکان جو بستی سے الگ تھلگ تھا۔ دراصل کسی زمیندار کا گودام تھا۔ ان دنوں وہ زمیندار شہر گیا ہوا تھا۔ اس کی غیر موجودگی میں ان لوگوں نے مکان کا تالا توڑ کر اس پر قبضہ کر لیا تھا اور چونکہ سیلاب کا خطرہ سر پر منڈلا رہا تھا اس لیے انہوں نے تمام چارپائیاں اور گھر کا ضروری سامان چھت پر رکھ لیا تھا۔ بڑی بڑی مونچھوں اور چیچک زدہ چہرے والے کو سب "استاد" کہتے تھے اور وہ آدمی جس کا قد لمبا اور چہرہ لمبوترا تھا "لمبی کھجی" کہلاتا تھا۔ کیونکہ اس کا جسم کھجور کے پیڑ کی طرح لمبا تھا۔ ایک اور آدمی تھا موٹا سا..... اسے سب "ہاتو" کہتے تھے کیونکہ وہ ہاتھی کے بچے کی طرح پھولا ہوا تھا۔

پہلے تو وہ راجہ کے سامنے کھل کر باتیں کرنے میں احتیاط سے کام لیتے رہے مگر جب انہوں نے دیکھا کہ یہ بے ضرر سا لڑکا ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تو وہ کھل کر باتیں کرنے لگے۔ ان کی باتوں سے راجہ کو معلوم ہوا کہ وہ کل یا پرسوں شام سے ایک ایسے آدمی کا انتظار کر رہے ہیں جو کشتی لے کر آئے گا۔ مگر اب تک وہ آدمی نہیں پہنچا تھا اور آج تیسرے دن کی شام بھی رات میں تبدیل ہو رہی تھی۔

آسمان پر ستارے چمکنے لگے تھے۔ راجہ اپنے موتی کو پیار کر رہا تھا اور ایک چارپائی پر بیٹھا سوچ رہا تھا کہ خدا جانے اماں اور منی کا کیا حال ہو گا۔ ادھر وہ سب کے سب آپس میں بیٹھے اس شخص کو گالیاں دے رہے تھے جس نے کشتی لے کر آنے کا وعدہ کیا تھا اور اب تک نہیں آیا تھا۔

استاد اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیر پھیر کر کہہ رہا تھا "آنے دو بچہ جی کو' اپنی دونالی بندوق سے ایسا فائر کروں گا کہ اس کی لاش سیدھی پانی میں جائے گی"۔

"کمبخت حرامخور نے سب کام چوپٹ کر دیا....." ڈبو نے زور سے کہا۔ لمبی کھجی اپنی گردن اور اونچی کر کے بولا:

"فکر نہ کرو ڈبو..... اسے آنے دو..... ایک ہاتھ سے پکڑ کر ہوا میں لٹکا دوں گا"۔

موٹا ہاتو بولا۔ "اس کا آملیٹ بنا کر کھا جاؤں گا..... بڑے زوروں کی بھوک لگی ہوئی ہے تین دن سے..... حرام ہے جو میں نے پچاس روٹیوں سے زیادہ کھایا ہو"۔

استاد گرج کر بولا: "ہاتھی کے بچے' ذرا کم کھایا کر..... تو نے تو تین ہی دن میں سب کا راشن برابر کر کے رکھ دیا..... ہی شاباشے..... واہ بھئی واہ....."

لمبی کھجی نے قہقہہ مار کر کہا:

"استاد تو نے خوب پہچانا اس موٹے پسو کو۔ یہ ہاتھی کا بچہ چار آدمیوں کی خوراک اکیلا کھا جاتا ہے اور پھر بھی بھوکا رہتا ہے۔ خدا جانے یہ بدبلا ہمارے پلے کہاں سے آپڑی ہے؟" ہاتو ایک دم ناراض ہو گیا' بولا:

"اوئے لمبی کھجی..... قطب مینار کی اولاد! زبان سنبھال کر بات کر۔ تو ہمیشہ میری مخالفت میں بولتا ہے۔ مجھے غصہ آ گیا تو تیری یہ لکڑی کی ٹانگیں چیر کر پانی میں پھینک دوں گا"۔

لمبی کھجی کو بھی غصہ آ گیا' بولا:

"او ڈبل ڈیکر کے بچے..... اپنے پہیوں اور زبان کو سنبھال کے رکھ..... ورنہ تیری پھونک نکال دوں گا"۔

ہاتو آگ بگولا ہو گیا..... استاد کی طرف مڑ کر بولا:

"استاد..... اس کاٹھ کے بندر کو منع کر لو ورنہ میرے قدموں میں اس کی لاش تڑپتی نظر آئے گی۔ ایک ہی کارتوس میں اس کا فلوس نکال دوں گا"۔

استاد نے اچانک تیوری پر بل چڑھا لیے۔ گرج کر بولا:

"خاموش"۔

استاد کی گرجتی ہوئی آواز کا اثر فوراً ہوا۔ دونوں دبک کر بیٹھ گئے۔ استاد کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوا..... چنگھاڑ کر بولا "ایک تو وہ گیدڑ کا بچہ کشتی لے کر نہیں پہنچا..... اوپر سے تم لوگوں نے جنگ چھیڑ دی ہے۔ پاگلو..... بیوقوفو! ٹارچیں جلا کر ادھر ادھر دیکھو کہیں وہ کشتی لے کر آ تو نہیں رہا۔ میں ذرا لیٹتا ہوں..... کشتی آجائے تو تم مجھے جگا دینا"۔

استاد کا حکم سنتے ہی وہ چھت کے چاروں طرف پھیل کر اپنی بڑی بڑی ٹارچوں سے پانی پر ادھر ادھر روشنی ڈالنے لگے۔ وہ مستقلاً بٹن دبا کر روشنی نہیں کر رہے تھے بلکہ بار بار ٹارچوں کو جلا بجھا رہے تھے تاکہ ان کے سیل نہ ختم ہو جائیں"۔

کم از کم راجہ یہی سمجھا۔ حالانکہ اسے حیرت تھی کہ رات کو یہ لوگ لالٹین کیوں نہیں جلاتے۔ کیونکہ دن کو وہ ایک لالٹین بھی دیکھ چکا تھا جس میں اچھا خاصا تیل بھرا ہوا تھا اور چمنی بھی صحیح سلامت تھی۔

اچانک مشرقی کونے پر کھڑا ہوا لمبی کھچی چلانے لگا:

"آرہی ہے..... آرہی ہے....."

راجہ چونک کر اٹھ بیٹھا۔

ڈبو اور ہاتو بھی لمبی کھچی کے قریب جا کر ٹارچوں سے پانی پر روشنی پھینکنے لگے۔

"ادھر ہی آرہی ہے"۔

استاد پلنگ سے اٹھا..... تکیے کے نیچے سے اس نے دو نالی بندوق اور کارتوسوں کی پیٹی اٹھائی اور لپک کر ادھر پہنچ گیا جہاں ڈبو، ہاتو اور لمبی کھچی خوشی سے چیخ رہے تھے"۔

"کشتی آرہی ہے..... کشتی ادھر ہی آرہی ہے"۔

راجہ نے بھی اٹھ کر ان کے قریب جانا چاہا مگر ایک گرجتی ہوئی آواز نے اس کے قدم روک دیئے۔ استاد کہہ رہا تھا

"ہی شاباشے..... وہیں ٹھہرو..... جب تک میں حکم نہ دوں اپنی چارپائی سے نہ اٹھنا..... خبردار!" یہ کہہ کر وہ مشرقی دیوار کی طرف مڑا اور بندوق کی نال کا رخ آسمان کی طرف کر کے گھوڑا دبا دیا۔

ہوائی فائر کی آواز دور تک پانی سے ٹکراتی ہوئی پھیلتی ہی چلی گئی۔ ایک لمحے تک خاموشی طاری رہی پھر جواباً گولی چلنے کی آواز آئی۔ یہ ہوائی فائر کشتی میں سے کیا گیا تھا۔

"وہی ہے..... وہی ہے"۔ استاد جوش میں بولا۔

"شاباشے..... اپنی اپنی بندوقیں اور لاٹھیاں سنبھال لو کشتی قریب آرہی ہے"۔

پانی میں شپاشپ چپو چلنے کی آواز آئی..... پھر کشتی مکان کے روشندان کے قریب آکر رک گئی..... کچھ دیر تک وہ چھت کی دیوار پر سے جھک جھک کر اپنی ٹارچوں کی روشنی سے کشتی کو لنگر ڈالنے میں مدد دیتے رہے۔ جب کشتی کی رسی کو روشندان کی ایک سلاخ سے باندھ دیا گیا تو وہ سب مڑ کر اپنا اپنا سامان سمیٹنے لگے۔ پھر وہ چارپائی کے سہارے کود کود کر کشتی میں سوار ہونے لگے۔ سب سے زیادہ ہاتو کو دقت پیش آئی جو موٹا ہونے کی وجہ سے نیچے اترتے ہوئے ڈر رہا تھا۔ جب کئی مرتبہ کوشش کے باوجود وہ نیچے پہنچنے میں کامیاب نہ ہو سکا تو چھت پر کھڑے استاد نے اس کا موٹا بازو پکڑ کر کہا۔

"اترتے ہو یا دوں دھکا"۔

ہاتو کانپنے لگا' ہاتھ جوڑ کر بولا:

"استاد! خدا کے لیے دھکا نہ دینا ورنہ میں ڈوب جاؤں گا' غرق ہو جاؤں گا۔

استاد ہونٹ بھینچ کر بولا: "ہی شاباشے' پھر اترو جلدی سے"۔

ہاتو بولا: "ہمت نہیں پڑ رہی ہے استاد' پانی سے دل ڈرتا ہے"۔

استاد کا رویہ اچانک بدل گیا..... غرا کر بولا:

"ہمت نہیں تھی تو ہمارے ساتھ کیوں آئے تھے۔ کس ڈاکٹر نے مشورہ دیا تھا تمہیں..... ایں.....؟"

یہ کہہ کر اس نے اپنی انگلیوں کو ہاتو کی موٹی گردن پر جما

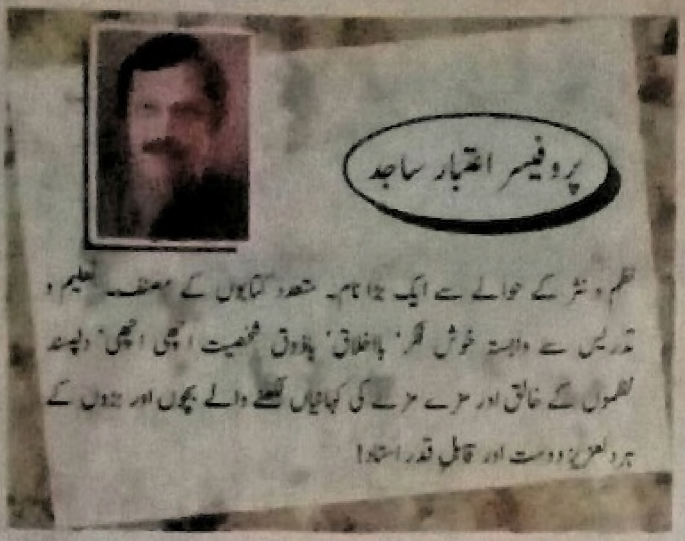

دیا اور اسے ہلکے ہلکے دبانے لگا۔

"مم..... مم..... مر جاؤں گا استاد..... مر جاؤں گا"۔ ہاتو گھگھیانے لگا۔

"مر جاؤ....." استاد نے بے نیازی سے اس کی گردن کو جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔

"تمہارے جیسے بزدل پٹھو کی مجھے کوئی ضرورت نہیں' اترتے ہو یا گراؤں پانی میں؟"

"نیچے تو میں نہیں اتر سکتا" ہاتو نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"چلو میں پہنچاتا ہوں....." استاد نے کہا اور پوری قوت سے اسے دھکا دے کر بولا: "وہ مارا..... ہی شاباشے"۔

دھپ کی آواز آئی اور ہاتو قلابازیاں کھاتا ہوا پانی میں جا گرا۔

استاد نے دیوار پر سے چھلانگ لگائی اور پھرتی سے کشتی میں اتر گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ روشندان میں بندھی ہوئی رسی کھول رہے تھے۔ راجہ خطرے سے بے پروا ہو کر ہاتو کی جان بچانے کے لیے دیوار کی طرف لپکا۔ موتی بھی عف عف کرتا ہوا اس کے پیچھے آیا۔ وہ لوگ ٹارچوں کی روشنی میں ڈوبے ہوئے ہاتو کو چھوڑ کر قہقہے لگاتے ہوئے کشتی آگے بڑھا رہے تھے۔

"مدد..... مدد!" ہاتو نے پھولے ہوئے سانسوں میں ڈبکیاں کھاتے ہوئے کہا۔ راجہ تیزی سے دیوار پر لٹک گیا مگر اس سے پہلے کہ وہ تیرتا ہوا ہاتو تک پہنچے' کشتی کی طرف سے ٹارچ کی روشنی اس پر پڑی اور استاد نے ہی شاباشے کہتے ہوئے اپنی دو نالی بندوق سے اس پر فائر کر دیا۔ راجہ نے سانس روک کر غڑاپ سے پانی میں ڈبکی لگا دی۔ سنسناتی ہوئی گولی دیوار میں پیوست ہو گئی۔ ☆☆☆

(پھر کیا ہوا؟ یہ سب کچھ جاننے کے لیے ملاحظہ کیجیے آئندہ ماہ قسط نمبر 5)

بلا عنوان

اس کارٹون کا اچھا سا عنوان تجویز کیجئے اور 500 روپے کی کتابیں لیجئے۔
عنوان بھیجنے کی آخری تاریخ 10 جون 2005ء

مئی 2005ء کے "بلا عنوان کارٹون" کے لیے بے شمار عنوان موصول ہوئے جن میں سے جج صاحبان کو مندرجہ ذیل 6 عنوانات پسند آئے اور ان کے مطابق یہ 6 ساتھی انعام کے حق دار قرار پائے۔

☆ علی اسد' لاہور ("چھوٹے میاں' سبحان اللہ" پہلا انعام: 100 روپے کی کتابیں)

☆ عبدالقادر' حیدر آباد ("میری سواری سب سے نرالی!" دوسرا انعام: 95 روپے کی کتابیں)

☆ حسنیٰ مظہر' نایرہ غازی خان ("گھوڑا نہیں تو پایا ہی صحیح!" تیسرا انعام: 90 روپے کی کتابیں)

☆ زنیرہ طاہر' فیصل آباد ("آج کی دنیا" چوتھا انعام: 80 روپے کی کتابیں)

☆ جیرہ اعجاز' اسلام آباد ("اباجی' ریٹائرمنٹ کے بعد!" پانچواں انعام: 75 روپے کی کتابیں)

☆ افراح شجیع' میرپور آزاد کشمیر ("انوکھا لاڈلا" چھٹا انعام: 60 روپے کی کتابیں)

The Taleem-o-Tarbiat, Lahore
RL NO. 154 PAKISTAN'S MOST WIDELY READ URDU MAGAZINE FOR CHILDREN OF ALL AGES Price Rs. 25.0